مشرقی افسانے

مشرقی افسانے

مترجم

مولانا عبدالرحمان بیخود

مرتبہ و شائع کردہ

بنگالی اکیڈمی

بردوان ہاؤس۔ ڈھاکہ ۔ ۲ ایسٹ پاکستان

مطبوعہ ایسٹ پریس کراچی ٹیلیفون نمبر 6229

فہرست

نمبر		صفحہ
۱	خزانہ کا سانپ قاضی نذرالاسلام	۱
۲	بہشت کا خط ڈاکٹر محمد شہید اللہ	۳۵
۳	آدو بھائی ابو المنصور احمد	۴۰
۴	آب و ہوا محبوب عالم	۵۵
۵	ڈاکٹر مرنیو محی الدین	۶۵
۶	(لیڈر) نیتا ابو جعفر شمس الدین	۸۳
۷	(دو آنکھیں) دوئی چوکھ شوکت عثمانی	۹۵

صفحہ	نمبر
۱۱۴	۸۔ مرتیو بشودھا (مردا زمین) فرخ احمد
۱۴۰	۹۔ (ایک ھی تلسی کا چھیر کاھنی) تلسی کے ایک درخت کا افسانہ سید ولی اللہ
۱۵۴	۱۰۔ بتاشی سردار زین الدین
۱٦٦	۱۱۔ جبرائیل ارڈانا (جبریل کا بازو) شاھد علی
۱۹۳	۱۲۔ پتھ جانا نائی (راہ جانی پہچانی نہیں) شمس الدین ابوالکلام
۲۰۸	۱۳۔ برشٹی (بارش) علاؤالدین آزاد
۲۳۲	۱۴۔ آدیم (پرانا) عبدالغفار چودھری
۲۴۷	۱۵۔ کنگالن دولت النسا خاتون

قاضی نذرالاسلام

۱۳۰۶ب کی بارھویں جیٹھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء کو موضع چورولیا ضلع بردوان میں قاضی نذرالاسلام کی ولادت ہوئی . ان کے والد کا نام قاضی فقیر احمد تھا اور والدہ زاہدہ خاتون . آٹھ سال کی عمر میں وہ والد کے سائے سے محروم ہو گئے . ۱۳۱۴ب میں انھوں نے لور پرائمری پاس کیا اور پھر کچھ دنوں تک رانی گنج شیر شول اور ماتھرن ہائی اسکول میں کچھ دنوں تک تعلیم حاصل کی لیکن مالی دشواریوں کی بنا پر سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکے . پھر آسنسول جاکر روٹی بیچنے والے ایک دوکاندار کے یہاں پانچ روپیہ ماہوار کی ملازمت کرلی . گاؤں میں رہتے رہتے ہی انھوں نے اپنے چچا فضل کریم صاحب سے اردو اور فارسی میں کچھ شد بد حاصل کی تھی . گانے اور ساز بجانے میں انھوں نے بچپن ہی سے اپنے شغف کا اظہار کیا تھا. گانےوالوں کی ایک جماعت جو اسنسول کے مغربی علاقے میں گھوم پھر کر گاتی بجاتی تھی ان کے لئے بہت سے گانے انھوں نے بچپن ہی میں تیار کئے تھے . نانبائی کی دوکان میں ملازمت کرتے وقت ہی آسنسول میں وہاں کے داروغہ قاضی رفیع الدین نذرالاسلام کے ساز بجانے پر گرویدہ ہو کر میمن سنگھ ضلع کے تریسال تھانے میں موضع قاضی شیلا اپنے گاؤں لے آئے . انھوں نے نذرالاسلام کو دھری رام پور ہائی اسکول کی ساتویں جماعت میں داخل کر دیا . یہاں بھی وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے . سالانہ امتحان دیکر وہ بلا اطلاع پھر رانی گنج چلے گئے اور ۱۹۱۵ء کی ابتدا میں پھر انھوں نے شیر شول ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا . یہاں انھوں نے دو سال تک تعلیم حاصل کی اور سنسکرت چھوڑ کر اسکول کے معلم حافظ نورالنبی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی .

بچپن ھی سے نذرالاسلام بڑے خیالی طبیعت کے آدمی تھے . اسی جذبے کے ماتحت انھوں نے ۱۹۱۷ء میں میٹرک ٹسٹ میں شرکت کر کے ۴۹ نمبر ریجمینٹ میں بطور ایک فوجی کے داخل ھوئے اور لاھور ھوتے ھوئے نوشیرہ چلے گئے . پھر وہ کراچی چھاؤنی میں تبدیل ھو کر آگئے اور تھوڑے ھی دنوں میں کوارٹر ماسٹر یعنی حولدار مقرر ھو گئے . کراچی قیام کے زمانے ھی میں انکی ملاقات ایک پنجابی عالم سے ھوئی جن سے خواجہحافظ شیرازی کاکلام سن کر وہ بیحد متاثر ھوئے . وھیں مولوی صاحب سے انھوں نے فارسی زبان باقاعدہ طور پر پڑھی . ما بعد کے زمانے میں انھوں نے حافظ اور عمر خیام کے اشعار فارسی سے بنگلا زبان میں منتقل کئے . کراچی کے زمانہ قیام ھی میں وہ افسانے اور نظمیں لکھتے رھے . ان کی پہلی مجموعہ نظم کا نام ''مکتی'' ھے

۱۹۱۹ء میں ''بنگیو مسلمانشاھتو پتریکا'' کی اشاعت شروع ھوئی جس میں ان کی مشہور کتاب '' بیتھار دان '' جس کی پہلی نظم کا عنوان بھی یہی ھے شائع ھوئی .

وطن واپسی کے بعد قاضی نذرالاسلام نے پورے جوش و خروش کے ساتھ ادب کی خدمت شروع کی. مسلمبھارت اخبار میں ۱۳۲۸ب کے کاتک مہینے کے شمارے میں ان کی نظم '' بد روھی اور کمال پاشا '' دونوں نظمیں شائع ھوئیں . ان نظموں نے سارے ملک کے ادیبوں میں ان کی قوت فکر اور طاقت اظہار خیال کی جانب توجہ پیدا ھوئی . بنگال کے نوجوانوں کی جماعت ان نظموں پر دیوانوں کی طرح آگے بڑھی . اس جماعت میں روبندر ناتھ بھی تھے . اب وہ انگریزی کے خلاف تحریکات میں روح پھونکنے لگے . اسی زمانے میں ایک تیز و تند نظم لکھنے کی پاداش میں انھیں کچھ دنوں کے لئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں .

۱۹۴۲ء تک انھوں نے بنگلا زبان کو ھر طرح کی تقویت پہنچائی ھے. نظمیں ، افسانے، ناول، ڈرامے، مضامین وغیرہ مختلف اصناف سخن وانواع ادب کو انھوں نے اپنے پرزور افکار سے تقویت بخشی ھے . بہت سارے اسلامی گانے بھی ھیں جنکی تعداد تین ھزار تک پہنچتی ھے . اغلب ھے کہ اتنے گانے اور کسی بنگالی شاعر نے مرتب نہیں کئے. بنگلا زبان کے مشہور سروں

سے بغاوت نہ کرتے ہوئے بھی انہوں نے بہت ساری راگ راگنیاں عربی، فارسی، اردو ، اور دکھن بھارتی نظموں اور سروں کے اختلاط سے تخلیق کیں اور انہیں اپنے گانوں میں محلول کیا .

نزرالاسلام کی مصنفہ تقریباً پچالیس کتابوں میں سے انکی ، اگنی‌بنیا، دولن‌چاپا، پوربیرهوا، چکروبان، شندوهندو، زنجیر، سنچیتا، مروبهاشکر، بشیربانشی ، کمبهےپهول وغیرہ نظموں کی کتابیں ، باندهن‌هارا ، بیتهارگان، مرتیو کهودا، کوهولوکا، شیولی‌مالا، رکتیربیدن وغیرہ ناول اور افسانوں کا مجموعہ جهیلی میلی، عالیہ، مدهومالا، پوتولیر بی‌اے وغیرہ ڈرامے نظم میں پارہ عم، رباعیات عمر خیام، دیوان حافظ وغیرہ منظوم تراجم اور ذوالفقار، بلبل گیت، شتودل ، بن‌گیتی، نذرل‌گیتیکا، گانیرمالا، شورساقی وغیرہ کتابیں جگ‌بانی دوردنیرجاتری، ردرو منگل وغیرہ مظامین کی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں

یہ کہنا لاحاصل ہے کہ نزرالاسلام صرف بنگالی مسلمانوں کے سب سے بڑے شاعر نہیں ہیں بلکہ آج تک ان کے مقابل کوئی بنگالی مسلمان شاعر پیدا نہیں ہو سکا . روبندر ناتھ کے دور میں غالباً وہی فرد فرید ہیں جن پر روبندر ناتھ کا کوئی اثر نہیں پڑا . بحیثیت شاعر کے بھی روبندر ناتھ کے بعد انہیں کا درجہ ہے . ان کی بہت ساری کتابیں ، نظمیں اور افسانے وغیرہ دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں .

افسوس ہے کہ عرصہ دراز سے یہ شاعر فالج میں مبتلا ہو کر فکر ، کلام اور ہر طرح کی گفتگو سے عاجز اور مجبور ہے ..

خزانے کا سانپ

رسول پور کے میر صاحبان کی حالت دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اس طرح بن سنور گئی کہ جیسے چھپر پھاڑ کر قسمت کی دیوی نے اپنا پورا سایہ اس پر ڈال دیا ہو۔ لوگ کانا پھوسی کرنے لگے کہ شاید جنوں کی دولت یا روحوں کا خزانہ انہیں کہیں سے مل گیا ہے ورنہ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ دو ہی سال کے اندر ان کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہو جائے۔ علاالولدین کے چراغ کے بغیر تو اس تبدیلی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

دس سال پہلے بھی میر صاحبان کی حالت گاؤں کے کسی زمیندار کے مقابلہ میں ہیٹی نہ تھی مگر چند ہی دنوں میں وہ سب دھن دولت دھنئے کی روئی کی طرح اڑ گئی اور پھر حالات ناگفتہ بہ ہوتے گئے۔

لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انہوں نے مرشدآباد والے نواب سے ٹکر لی تھی اور پھر اس چوہے اور ہاتھی کی ٹکر کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ شانداری کی بھی تو کوئی آخر حد ہے؟ کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھول گیا۔ لوگوں سے سنا گیا کہ یہ بھی اپنی کھڑاؤں میں سونے کی کھونٹی لگانے لگے تھے۔ آخر اس حد سے بڑھی ہوئی شانداری ہی نے انہیں یہ برے دن دکھائے کہ ایسے اقبال مند باپ کے کم نصیب فرزند کو اپنے

ھی گاؤں میں ایک مکتب کی معلمی کر کے پیٹ پالنا پڑا ۔

ایسے خوش‌نصیب دادا کے کم‌نصیب پوتے کو کسی زمیندار گھرانے کی لڑکی کیسے مل سکتی تھی ۔ تاہم جس گھر کی لڑکی سے اس کی شادی ہوئی آس گھر کی خاندانی وجاہت میر صاحب سے یقیناً کچھ بیس ھی تھی ۔

مرحوم میر صاحب کے پوتے کا نام عارف تھا اور اس کی رفیقۂ حیات کا نام زہرہ ۔ زہرہ کے حسن کی شہرت آس پاس کے تمام گاؤں میں ضرب‌المثل بن چکی تھی ۔ لیکن اس حسن اور اس خاندانی وجاہت کے باوجود کسی نواب‌زادے نے اس سید زادی کو اپنی رفاقت میں قبول کرنے کے لئے نہ ھی کوئی آرزو ظاہر کی اور نہ شوق دکھایا ۔

ماں باپ یہ بھی تو برداشت نہیں کرسکتے کہ لڑکی کو گھر میں بیٹھا کے بڑھیا بنا ڈالیں اور اسی لئے تمام ناپسندیدگی اور ناراضی کے باوجود سید صاحب کو اپنی لڑکی مکتب کے ایک معمولی معلم عارف کے ساتھ ھی بیاھنی پڑی ۔

میر صاحب کے گھرانے میں لکشمی دیوی کی ناراضی کے باوجود حسن کی دولت کا کال نہ تھا ۔ حسن و جمال کی یہ دولت قطب پور کے سادات کو بھی ان کے مقابلے میں ھمیشہ شرمسار کرتی رھی ۔ اس لئے عارف اور زہرہ زن و شو کی حیثیت سے جب اکٹھا کھڑے ہوئے تو ان کے حسن و جمال نے قران‌السعدین کا منظر پیش کر دیا اور سب کی آنکھیں انہیں دیکھ کر اس طرح ٹھنڈی ہوئیں جیسے پورنیما کے چاند پر نظریں جمانے سے آنکھیں ٹھنڈک محسوس کرتی ھیں ۔

زہرہ کے والد اس رشتے سے اگرچہ خوش نہ تھے مگر اس

کی ماں تو مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوگئی ۔ اس نے لڑکی اور داماد کا روشن چہرہ دیکھ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور دونوں کو دل کھول کر دعائیں دیں ۔ اس جمیل جوڑے نے بھی ایک دوسرے کو محبت ، شوق ، شرم اور ہمت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئے ۔

عارف کی والدہ ادھر کچھ دنوں سے دائم المریض بن کر صاحب فراش ہوگئی تھیں۔ بہو کے آتے ہی وہ آہستہ آہستہ اچھی ہونے لگیں اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھلی چنگی ہوکر اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ وہ مارے خوشی کے از خود رفتہ ہو کر ہر آنے جانے والے سے یہی کہتیں کہ میری بہو بڑی مبارک قدم ہے۔ اس کے اس گھر میں قدم رکھتے ہی میں موت کے گھر سے پلٹ آئی ۔ اب پھر بہت جلد میرا گھر چاندی سونے سے جگمگانے لگے گا ۔

سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ میرصاحبان کے گھر خوش نصیبی کی لکشمی دیوی نے نئی بہو کے روپ میں جنم لیا ہے۔ انسان کی مبارک قدمی بھی ضرور کوئی ایسی چیز ہے جسے لوگ بلاوجہ نہیں مانتے۔ زہرہ جس دن سے میرصاحب کے گھر آئی اسی روز سے میر صاحب کی مفلسی اور تنگ حالی بڑی تیزی سے خوش حالی اور فارغ البالی میں تبدیل ہونے لگی ۔

لوگوں میں یہ چرچا بھی ہونے لگا کہ میرصاحب کی نئی بہو نے آتے ہی ان کے مورثوں کا مدفون خزانہ کھوج نکالا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے گھر نا معلوم دروازوں سے دھن برسنے لگا ہے ۔ ایسی غیر معمولی تبدیلی بھی تو بے سبب نہیں ہو سکتی ۔

یہ افواہ بالکل بے بنیاد بھی نہ تھی ۔ زہرہ ایک دن اپنے سسرالی پرانے لق ودق مکان کی دیوار میں ایک شگاف دیکھ کر کچھ

خوف زدہ ہوئی۔ مگر اس نے اس کا کھوج نکالنے کے لئے اک ذرا ہمت سے کام لیا اور ایک لکڑی سے اسے چھیڑ کر نتیجہ کا انتظار کرنے لگی۔ ممکن ہے کہ کسی پرانے خزانے کی تلاش ہی اسے ایسا کرنے پر اکسا رہی ہو۔ اب اس نے ایک لاٹھی ہاتھ میں لے کر اس شگاف سے اک ذرا اور چھیڑ کی۔ چھیڑ کرتے ہی اندر سے ایک غضب ناک سانپ کے پھنکارنے کی خوفناک آواز سنائی دی اور وہ دوڑی ہوئی اپنے شوہر کے پاس گئی اور آس سے سب حال کہا۔

یہ کہنا لاحاصل ہے کہ عارف کو اپنی بیوی سے غیر معمولی محبت ہوگئی تھی۔ عارف ہی کیوں ساس، سسر بلکہ گھر بھر کے سب لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں میں جگہ دی تھی۔ عارف نے زہرہ کی زبانی اس کی نامناسب بہادری کا قصہ سن کر پہلے تو کسی قدر ناراضگی ظاہر کی لیکن پھر اس نے خود جاکر دیکھا کہ اندر سے کسی سانپ کی خوفناک گرج سنائی دے رہی ہے۔ اب اس نے اپنے والد کو بھی بلا کر وہ جگہ دکھائی۔

بیٹے کے مقابلے میں والد اک ذرا زیادہ ہمت ور تھے۔ انہوں نے اپنا فیصلہ سنادیا کہ اس سانپ کو بہرحال مار ڈالنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت بے وقت وہ کسی کو اپنے تیز اور زہر آلود دانتوں کا شکار بنا ڈالے۔ پھر یہ کہ اس کی خوفناک آواز بھی یہ بتارہی تھی کہ یقیناً وہ کوئی خطرناک قسم ہی کا سانپ ہے۔ خسر صاحب اپنی بہو کے بے حد شکر گذار ہوئے کہ اس کی بدولت اس خطرناک دشمن کی اطلاع مل گئی۔

یہ جگہ کس قدر ناصاف تھی اور جنگلی جھاڑیوں اور گھاس پھوس سے بالکل جنگل جیسی معلوم ہوتی تھی۔ اسے کسی قدر صاف کرنے کے بعد اک ذرا چھیڑ چھاڑ کرتے ہی ایک بہت

بڑا چتیوں والا چوٹی دار ناگ اس میں سے پھنکاریں مارتا ہوا باہر نکل آیا . اس کے سر پر سرخ رنگ کا ایک تاج یا کھڑاؤں کی کھونٹی جیسی چوٹی یا ابھری ابھری کلغی تھی . عارف نے اسے مارنے کے لئے لاٹھی اٹھائی مگر اس کے والد نے منع کرتے ہوئے کہا "خبردار، خبردار ! اسے نا مارنا . دیکھتے نہیں کہ وہ خزانے کا کلغی دار سانپ ہے؟ ایسے سانپوں کو مارا نہیں کرتے".

عارف کی مضبوط لاٹھی ہوا میں بلند ہوکر رہ گئی اور جھاڑیوں میں وہ تاجدار ناگ روپوش ہوگیا .

سب واپس آنے لگے مگر زہرہ نے عارف کو الگ بلاکے کہا : "آپ لوگ جس وقت سانپ کو چھیڑ کر اسے چرکے لگا رہے تھے اُس وقت ایک عجیب قسم کی کھنکدار آواز سننے میں آرہی تھی . یقیناً وہاں کانسے یا پیتل کا کوئی برتن موجود ہے جس سے ٹکرانے ہی کی وہ آواز تھی ."

زہرہ کی زبانی یہ باتیں سن کر عارف کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں. انھوں نے اپنے والدکو اس بات سے مطلع کیا پہلے تو انھوں نے اس کا اعتبار نہ کیا اور کہا : "نہیں تو ! میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی؟"۔ مگر عارف نے یہ کہہ کے ان کی تشفی کردی. " چونکہ ہم لوگ اس وقت ہمہ تن سانپ کے خیال میں مستغرق تھے اور اس کی وجہ سے متردد تھے اسی لئے ہم لوگوں نے آواز پر کوئی دھیان نہیں دیا ."

باپ بیٹے نے اب دیوار کے پاس پہنچ کر چند اینٹیں اکھاڑیں تو انھیں اندر سے کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی . اب تو باپ بیٹے نے بڑی ہمت کے ساتھ دو گھنٹے تک جان توڑ محنت کی. اس کے بعد انھیں جو کچھ ملا اسے ہم کوئی مخفی خزانہ تو نہیں کہہ

سکتے مگر وہ بالکل حقیر اور کم قیمت بھی نہ تھا . خصوصاً ان کی موجودہ حالت میں تو یقیناً وہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہی کہا جاسکتا تھا . انھیں غیر معمولی طور پر ایک بڑی پیتل کی ٹھلیا بادشاہی دور کی اشرفیوں سے بھری دکھائی دی . لیکن اس ٹھلیا کو حاصل کرنا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا .

عارف جب اس ٹھلیا کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تو اسے نظر آیا کہ ایک اور کلغی دار سانپ اس ٹھلیا کی گردن سے لپٹا ہوا اس دھن کی حفاظت کر رہا تھا . عارف خوف سے ایک ہی جست میں تقریباً دس ہاتھ پیچھے آگرا اور بے اختیار ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی ــ باپ رے باپ ـ وہی سانپ پھر پلٹ کر اپنی جگہ پر آگیا ہے .

زہرہ نے بلند آواز سے کہا ــ نہیں نہیں، یہ کوئی دوسرا سانپ ہے . ممکن ہے کہ یہ اسی پہلے سانپ کا جوڑا ہو . اس سانپ کو تو میں نے خود دوسری جانب جاتے دیکھا تھا .

مگر یہ سانپ چاہے پہلے والا ہو یا دوسرا کسی طرح بھی ٹھلیا چھوڑ کر جانے پر راضی نظر نہ آتا تھا . اس پر طرہ یہ کہ ایسے خزانے کے سانپوں کو مارنا بھی منحوس سمجھا جاتا ہے .

ٹھلیا کی گردن کو گھیرے میں لئے ہوئے ہی اب وہ ناگ اپنا پھن بڑھا بڑھا کر ان لوگوں کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا جنھوں نے اس کی عافیت میں خلل ڈالا تھا اور اس کے عیش میں مخل ہوئے تھے . زہرہ کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے گھر میں سے ایک پیالہ دودھ لاکر اس ٹھلیا سے کچھ فاصلے پر رکھ دیا . دودھ کی مہک پاتے ہی سانپ نے ٹھلیا کا گلا چھوڑ دیا اور چپ چاپ جاکر دودھ پینے میں مشغول ہوگیا . زہرہ کو اک ذرا

فرصت جوملی تو اس نے تیزی کے ساتھ ٹھلیا وہاں سے اٹھا کر عارف کے حوالے کر دی . سانپ اگر چاھتا تو بے تکلف اس کے ھاتھوں میں ڈس سکتا تھا مگر اس نے کچھ تعرض نہ کیا . دودھ پیتے وقت کسی کیڑے جیسی جھیں جھیں کی آواز بھی منہ سے نکالنے لگا. ایک لمحہ بھی نہ گذرا تھا کہ پہلے ناگ نے بھی جھاڑی سے سر نکال کر دودھ میں سے اپنا حصہ وصول کر لیا اور اب دونوں ھی اس دودھ سے اپنا پیٹ بھرنے لگا .

زھرہ بول اٹھی—وہ دیکھئے ، وہ ھے پہلا سانپ . اس کے جسم کو لاٹھی سے جو چرکے لگے تھے اس کا نشان بھی اس کے جسم پر موجود تھا. زھرہ بولی — ھائے ھائے ، دیکھئے تو کس طرح وہ جگہ نیلی ھو گئی ھے .

عارف اور اس کے ماں باپ بڑی حیرانی اور پریشانی کے ساتھ زھرہ کے کرتوت دیکھ رھے تھے . اس پریشانی میں انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ زھرہ کو خطرناک سانپوں سے بچائیں کیونکہ اگر وہ چاھتے تو آسانی سے اسے اپنا شکار بنا سکتے تھے . ٹھلیا تو انھوں نے لے لی تھی مگر اب ھوش آیا اور وہ زھرہ کو وھاں سے دور ھٹا لائے .

ٹھلیا میں اشرفیاں پاکر عارف اور اس کے گھر والے اس درجہ خوش ھوئے کہ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ کیسے زھرہ پر اپنی جانیں قربان کر دیں یا اسے کوئی غیر معمولی عزت بخشیں . یہ بات طے پاگئی کہ اس دفینے کو بلکل پوشیدہ رکھا جائے اور اس کا راز کسی پر ظاھر نہ کیا جائے . یہی وجہ تھی کہ گھر سے باھر کوئی کانوں کان بھی اس خزانے کی بابت کچھ نہ جان سکا .

اشرفیوں کو گلا کر عارف کلکتہ لے گیا اور فروخت کر آیا۔ اسی سرمائے سے اس نے کلکتہ میں کوئلہ کا کار و بار شروع کیا خدا کی شان اسے اس کار و بار میں امید سے زیادہ نفع ہونے لگا اور چند ہی دنوں میں یہ گھرانہ مالا مال ہو گیا۔ دو سال کے اندر ہی اندر میر صاحب کے گھر میں نئی تبدیلیاں ہوئیں اور اب نئے سرے سے ایک نئی شاندار حویلی تیار ہوگئی۔ نوکروں اور ماماؤں سے پھروہ گھر بھرا پرا نظر آنے لگا۔

عارف نے اس کے بعد اپنے کار و بار کو نت نئے طریقوں سے ترقی دی اور کارپوریشن کے ٹھیکے لے کر وہ لکھ پتی بن گیا۔ افلاس کی جگہ دولت مندی اور غربت کے بدلے امیری نے اپنا پورا پورا جلوہ دکھایا لیکن زہرہ کی وجہ سے وہ لوگ ایک عجیب اور شدید مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔

اشرفیوں سے بھری ٹھلیا پانے کے دن ہی سے زہرہ کو اس ناگ کے چوٹی دار جوڑے سے بے انتہا محبت ہو گئی۔ یہ ناگ بھی زہرہ کے پاس مرید بن گئے تھے اسے شفقت کا اثر کہئے یا دودھ اور کیلے کی چاٹ کہ وہ چٹورے بچوں کی طرح زہرہ کے پیچھے پیچھے پھرنے لگے۔ زہرہ کے ساس سسر اور شوہر اب ان سانپوں کی وجہ سے ہر وقت اپنے آپ کو موت کے منہ میں سمجھ کر بڑی ہی خوف زدہ حالت میں زندگی گذار رہے لگے۔ چونکہ یہ خزانے کے سانپ تھے اس لئے انہیں وہ مار بھی نہیں سکتے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں مار ڈالنے سے یہ دولت ہاتھوں سے نہ چھن جائے۔

اس میں شک نہیں کہ جس پرسکون اور بے خلل طریقہ سے یہ سانپ گھر میں بے ضرر مرغیوں کی طرح پھرا کرتے تھے ان سے خوف کھانے کی کوئی بات نہ تھی۔ یہ بڑے ہی شانتی پسند معلوم

ہونے مگر پھر بھی یہ یقین کہ یہ زہریلے ناگ ہیں خوف زدہ کرنے کے لئے کم نہ تھا ۔ کہیں خدا نخواستہ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر کاٹ کھائیں یا اندھیرے اجالے کسی کے پیر سے دب کر اگر دانت لگا دیں تو پھر لہر بھی نہ آئے گی ۔ غرض کہ ایک بڑی ہی پریشان کن اور غیر اطمینانی کیفیت میں اس گھر والے زندگی گذار رہے تھے ۔ زندگی اجیرن بن کے رہ گئی تھی ۔

اپنا گھر چھوڑ کے کہیں اور جا بسنا بھی تو سہل بات نہ تھی آبائی گھر اور پھر نئے سرے سے بنایا ہوا اس کی محبت جزؤ فطرت ہوگئی تھی ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آتی تھی کہ اب کیسے اس بلا سے نجات حاصل کریں ۔

زہرہ باورچی خانے میں ہے کہ یک بیک یہ ناگ کا جوڑا اس کے قریب آ کر پیروں کے پاس لیٹ گیا ۔ ساس دیکھتے ہی چیخ اٹھی ۔ اس پر زہرہ نے بھی ان کو اک ذرا جھڑکا اور ذرا تیز ہو کر ایسی حرکتوں سے منع کیا ۔ سانپ شائستہ بچوں کی طرح چپ چاپ وہاں سے کھسک گئے ۔

ساس اور بہو کھانا کھانے بیٹھی ہیں کہ یکایک اس خزانے کے محافظ جوڑے نے آ کر بہو کے پیالے میں منہ ڈال دیا ۔ جب دیکھا کہ دودھ نہیں ہے تو انھوں نے ایک پھنکار ماری اور پھن اٹھا کر آدھر غصہ بھری نظروں سے دیکھنے لگے ۔ مگر جہاں بہو نے انہیں انتظار کرنے کا حکم دیا وہ چپ چاپ سر جھکا کر فرماں بردار خادموں کی طرح ایک طرف لیٹ گئے ۔ پھر جب بہو نے دودھ لا کر دیا تو آسودہ ہو کر وہ نہ جانے کہاں روپوش ہوگئے یہ تھی تقریباً روز مرہ کی بات ۔ مگر ان سانپوں کو قریب دیکھ کر ساس کے پیٹ کا بھات کچا چاول بن جایا کرتا اور ان کا بند بند

کانپنے لگتا .

یہ بھی کسی نہ کسی طرح برداشت ہوتا رہا مگر اب جو جو حرکتیں ان سانپوں نے شروع کیں ان کے خوف سے عارف نے گھر کو خیرباد کہہ کے کلکتے ہی میں رہنا شروع کیا . سنسان راتوں میں کس ناموس پھنکار ساز جیسی آوازوں سے عارف کی نیند ٹوٹ جاتی. وہ اٹھ کر دیکھتا کہ اس کے بستر پر دونوں کلغی دار سانپ زہرہ کی گود میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں. عارف ایک چیخ کے ساتھ بھاگ کر بیرونی نشست گاہ میں رات گذارتا. زہرہ جب ناراضی ظاہر کرتی تو چپ چاپ سر جھکائے چلے جاتے . مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ سہمے ہوئے بچوں کی طرح ڈرتے ڈرتے واپس آتے اور اس کے پیروں میں لوٹ پوٹ کے اس کی منت و خوشامد کرتے .

یہ منظر دیکھ کے زہرہ آبدیدہ ہو جاتی . پھر ناراضی ظاہر نہ کر سکتی اور ایک سپیرن کی طرح انہیں اپنی گود میں لے لیتی . وہ ان سے کھیلتی اور ان کو خوش کرتی . پھر اپنے ساتھ سلا لیتی .

زہرہ کی شادی کے بعد ایک سال کے اندر ہی اس کے دو جڑواں بچے پیدا ہو کر چند ہی دنوں میں انتقال کر گئے تھے. وہ جب ان ناگوں کو دیکھتی تو اسے بے اختیار اپنے دونوں مرحوم بچے یاد آتے . وہ اپنی مادری محبت کے سپنے میں محو ہو کر یہ سوچنے لگتی کہ شاید وہ دونوں بچے ہی اس کی مامتا بھری کوکھ کو سکھ پہنچانے کے لئے عدم سے سانپوں کی صورت اختیار کر کے آئے ہیں اور اپنے طفلانہ کھیلوں سے اس کے غمزدہ دل کو بہلا رہے ہیں . وہ سوچتی کہ ان بچوں کی موت پر زہرہ کا جو کڑوا گھونٹ پی کر وہ برداشت کر چکی ہے اس کے مقابلے میں یہ ناگ اگر اسے ڈس بھی لیں تو ان کا زہر اس کے زیادہ تیز نہ ہو گا اور وہ ہنسی خوشی

برداشت کرلے گی۔

یہ سوچ سوچ کر اس بچوں سے محروم ماں کی ساری محبت تمام شفقت اور پوری پوری الفت انہیں سانپوں کی طرف مبذول ہو جاتی۔ خوف اور ڈر کا احساس بھی باقی نہ رہتا اور بے اختیار ان سانپوں ہی کو بچوں کی طرح گود میں لے لیتی۔ انہیں پیار کرتی، انہیں سینے سے لگاتی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتی۔ وہ انہیں بچوں کی طرح تھپکیاں دے دے کر اور لوریاں سنا سنا کر اپنی آغوش میں سلاتی اور اگر اک ذرا بھی نا خوشگوار حرکت کرتے تو ان پر بچوں ہی کی طرح خفگی ظاہر کرتی۔ بگڑتی، ڈانتی سرزنش کرتی اور پھر ان کے خاموش ہوجانے پر انہیں اپنی شفقت و محبت کا مرکز بنا لیتی۔

شوہر ناقابل برداشت غم و غصہ کی وجہ سے منہ پھلا لیتا۔ مگر آخر صورت بھی کیا تھی؟ وہ کرتا تو کیا کرتا اور وہ کرتی تو کیا کرتی۔ اس کے اور اس کی جان سے زیادہ پیاری بیوی کے درمیان دو زہریلے ناگوں کے پھن مفارقت پیدا کرانا چاہتے اور وہ انہیں ہٹانے پر بھی قادر نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا اور اپنی آگ میں آپ ہی جلتا۔ کوکھ کی آگ میں جلنے والی بیوی سے وہ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ وہ تو اپنی ناراضی بھی ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ آخر وہ بھی تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ غصہ کرتا تو حاصل کیا تھا آخر اس کا کیا قصور تھا۔

ایک دن اس نے ہزار ضبط کے باوجود کہہ دیا تھا ــ زہرہ میں تمہیں چھوڑ کر یہ دولت، یہ سونا اور یہ آرام نہیں چاہتا۔ تم اجازت دو تو میں ان دونوں کو ختم کردوں۔ ہماری غربت ہمارے لئے اس سے زیادہ تسکین بخش اور روح پرور تھی۔

زہرہ نے آنسو بھری آنکھوں سے یہ عاجزانہ درخواست پیش کی تھی ــ یہ میرے بچے ہیں. یہ تو کوئی نقصان نہیں کرتے. کسی کو دکھ نہیں دیتے . یہ تو کاٹنا اور ڈسنا جانتے ہی نہیں . انہیں مار کر آپ کیا پائیں گے ؟ ان سکھ شانتی بھرے بچوں پر رحم کیجئے .

عارف نے اک ذرا رنجیدہ ہوکر کہا ــ وہ تمہیں نہیں کاٹتے مگر ان کے زہر کی آگ میں میں بھسم ہوا جارہا ہوں . زہرہ ، تمہیں کیا معلوم کہ انہوں نے مجھے کیا نقصان پہنچایا ہے. انہوں نے کس طرح میرے دماغ کا سکون ، میرے دل کا چین اور میری آنکھوں کی نیند چھین لی ہے . اس طرح سسک سسک کر مرنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ واقعی مجھے ڈس لیتے. میں اس روز روز کے زہر پر اس ایک دن کے زہر کو ہزار گونہ ترجیح دیتا .

زہرہ اس کا کیا جواب دیتی . وہ خاموش آنسو بہاتی اور خود ہی اپنے آنچل میں جذب کرلیتی. وہ یہ بات بھی تو منہ کھول کے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ دونوں سانپ دراصل اس کے مرحوم جڑواں بچے ہی ہیں جو جنت سے اسے تسکین دینے کے لئے واپس آگئے ہیں. کہتی بھی تو کیسے کہتی . آخر سنسار اسے کیا کہتا .

آخر ایک دن ماں اور بیٹے نے یہ فیصلہ کیا کہ زہرہ کو کچھ دنوں کے لئے اس کے میکے بھیج دیا جائے. اس طرح ممکن ہے کہ وہ وہاں جاکر ان سانپوں کو بھول جائے اور سانپوں کا یہ جوڑا بھی جب اسے نہ پائے تو مایوس ہوکر کہیں اور چلا جائے .

ایک دن صبح ہی صبح عارف کے والد نے زہرہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا ــ بیٹی، تم بہت دنوں سے میکے نہیں گئی ہو . مجھے اس کا افسوس بھی ہے کہ تمہارے والد دو تین بار تمہیں

لینے کے لئے بھی آئے مگر میں نے کوئی نہ کوئی بہانا بنا کے تمہیں روک لیا ۔ اب میرا خیال ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے وہاں سے ہو آؤ۔ اس طرح ان کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔ میں نے عارف سے کہہ دیا ہے کہ وہ آج ہی تمہیں ساتھ لے جا کر کچھ دنوں کے لئے وہاں چھوڑ آئے۔

زہرہ نے سب کچھ سمجھ لیا مگر وہ اس پر کیا اعتراض کر سکتی تھی۔ اس نے خاموشی سے حکم سنا، آنسو پونچھے اور عارف کے ساتھ میکے چلی گئی۔ چلتے وقت اس نے بہت چاہا کہ ان سانپوں سے بھی رخصت ہو کر جائے۔ اپنی بے بسی کی کہانی اپنے آنسوؤں کی زبانی سنا کر دل کو تسکین دے لے مگر نہ جانے وہ کہاں تھے اور وہ ان سے مل کر نہ جا سکی۔

لڑکیاں میکے جانے میں خوشیاں مناتی ہیں مگر زہرہ کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اس کے لئے بچوں سے جدائی کا غم آج تازہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ اپنے دل کا دکھ درد کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

عارف نے زہرہ کو میکے میں چھوڑا اور خود کاروبار سنبھالنے کلکتہ چلا گیا۔

زہرہ کے والدین نے اپنی بیٹی کو حسن جمال میں لاثانی سمجھا تھا مگر آج جب وہ سر سے پیر تک سونے کے لباس میں لدی پھندی اور قیمتی سنہرے لباس میں ملبوس اپنے بچپن کے گہوارے میں داخل ہوئی تو غریب ماں باپ خود اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کر سکے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بیٹی اور داماد کو کہاں بٹھائیں اور کہاں جگہ دیں۔

چند ہی دنوں میں ماں باپ نے یہ محسوس کر لیا کہ بیٹی کے

ہونٹوں سے ہنسی رخصت ہو چکی ہے اور وہ ہر وقت نہ جانے کس دکھ کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ اس کی یہ فکر اور یہ سوچ ہر کام اور ہر حرکت سے ظاہر ہوتی تھی۔ ماں نے ایک دن تنہائی میں بیٹی سے پوچھا۔ بیٹی عارف کو آنے کے لئے خط لکھوا دوں؟ اس پر زہرہ نے شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے جواب دیا۔ نہیں اماں، وہ تو سنیچر کو خود ہی آئیں گے۔

عارف آئے اور رہے مگر زہرہ کے چہرے پر وہ رونق اور بشاشت جو اس کی زندگی کا لازمہ تھی اب نظر نہ آئی۔

ماں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ زہرہ! میری بیٹی! سچ سچ بتادے، کیا تیرا عارف سے کوئی جھگڑا ہے؟ زہرہ نے ایک مردہ ہنسی ہنس کر کہا۔ نہیں اماں، وہ مجھے پہلے ہی کی طرح مانتے ہیں۔

زہرہ کی والدہ عارف کے گھر میں مال و دولت کی اس نئی بہتات سے بالکل واقف نہ تھیں۔ لڑکی کے دوجڑواں بچے وفات پا چکے تھے اور وہ گھر کے سامنے ہی مدفون تھے۔ یہ بات انہیں معلوم تھی اس لئے انہوں نے یہی سمجھا کہ زہرہ انہی کے سوگ میں اپنے آپ کو گھلا رہی ہے۔ انہوں نے بھی بیٹی کے اس غم کو یاد کر کے آنسو کے چند قطرے بہائے اور پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے چھ مہینے بیت گئے۔ زہرہ کی رخصتی کے بارے میں کسی کے منہ سے کوئی بات نہیں سنی جاتی تھی۔ اب زہرہ اپنے والدین کو اس بات کا منتظر پانے لگی کہ کب اس کی سسرال والے اسے واپس طلب کرتے ہیں۔ اسے اپنی اس ذلت پر اور زیادہ غم ہونے لگا۔ وہ والدین پر بھی بار بن کر رہنا اپنی تذلیل سمجھتی تھی۔ اسے اپنا کوئی قصور بھی تلاش کرنے سے نہ ملتا

اور پھر وہ بے بس ہوکر رونے لگتی۔ عارف بھی ہر سنیچر کو کلکتہ سے آتا تھا مگر اشاروں میں بھی وہ کبھی رخصتی کا ذکر نہ کرتا۔ زہرہ شوہر سے بھی ایسے تذکرے میں اپنی اور اپنے میکہ کی ذلت سمجھ کر خاموش رہ جاتی تھی۔

ماں مگر صبر نہ کرسکی۔ اس نے ایک دن داماد سے کہا۔ بیٹا، زہرہ نے تو بالکل دانہ پانی چھوڑ دیا ہے۔ خدا جانے اسے کیا روگ لگا ہے کہ دن بدن سوکھتی جاتی ہے۔

یہ سن کر عارف کا دل کانپ اٹھا۔ اسے یہ وہم و گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ کوئی انسان زہریلے ناگوں سے بھی اس طرح دلی محبت کرسکتا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی زہرہ ایک وہم پرست لڑکی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ زہرہ کی دادی بھی سانپوں کا منتر جاننے میں بہت مشہور تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کے منتروں کا اثر زہرہ کی طبیعت پر پڑگیا ہو یا یہ کہ قدرت نے فطرتاً زہرہ کو اپنی دادی کا ہم طبع پیدا کیا ہو۔

اس اثنا میں وہ بار بار رسول پور گیا مگر زہرہ کے چلے آنے کے بعد دو ایک دن کے سوا اس نے آن سانپوں کو پھر کہیں نہیں دیکھا۔ مگر انہیں دو ایک دنوں میں ان سانپوں نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ ہر طرف پھن اٹھائے دوڑے دوڑے پھرتے تھے اور منہ سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکالتے تھے۔ ہر ایک یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ وہ ہر طرف زہرہ ہی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے زہر بھرے پھنوں کو دیکھ کر سارا گھر تھرا رہا تھا۔ سبھی انکی منت خوشامد میں لگے تھے۔ عارف، اس کے والد اور اس کی والدہ سب نے لاکھ جتن کئے مگر وہ کسی طرح خاموش نہ ہوتے تھے۔ وہ سانپ بھی باری باری ہر ایک

کے قدموں میں آ آ کر لوٹتے تھے اور وہ لوگ مارے خوف کے بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔

عارف نے سانپوں کی ان حرکتوں کا ذکر زھرہ سے کبھی نہ کیا اور نہ اس نے عارف سے ان سانپوں کے بارے میں کبھی کچھ پوچھا۔ وہ اس میں اپنی کسرشان میں سمجھتی تھی اور رسوائی بھی۔

داماد کسی طرح بیوی کو لے جانے پر راضی نہیں معلوم ہوتے۔ آخر ایک دن خود زھرہ کے والد نے عارف سے کہا۔ بیٹا تم جانتے ہو کہ ہم غریب آدمی ہیں۔ لڑکی کو ماشاءاللہ خدا نے خوش حال بنایا ہے۔ دیس قحط کے ہاتھوں تباہ حال ہے۔ ہر قسم کا خطرہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ اپنی غربت کی وجہ سے ہم لڑکی کا علاج کرانے سے قاصر ہیں۔ وہ بے زبان یہاں بے دوا علاج کے مرجائے اس سے بہتر ہے کہ یا تو تم اسے کلکتہ لے جاکر علاج کراؤ یا کم سے کم اپنے ہی گھر لے جا کر رکھو۔ خدا اچھا کردے تو پھر شوق سے یاں پہنچادینا۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پر نم ہوگئیں۔

آخر یہ بات طے پا گئی کہ دوسرے دن وہ زھرہ کو پہلے کلکتہ لے جائے گا۔ وہاں اس کا علاج معالجہ کرے گا اور صحتیاب ہونے پر آسے رسول پور لے جائے گا۔

(۳)

رات کو نہ جانے کس کی آواز سے عارف کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا کہ اس کے سرھانے کوئی شخص کھلی ہوئی تلوار ہاتھوں میں لئے کھڑا ہے۔ پاس کے کمرے سے کسی دوسرے شخص کی آھٹ معلوم ہوئی جیسے کوئی زھرہ کا بکس توڑ کر اس کے زیورات نکال رہا ہے۔ خوف سے عارف مردہ

بنا پڑا رہا ۔ آسے خوف سے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے آس کی طاقت گویائی سلب کرلی ہے ۔ خوف کے باوجود اس کے دل میں عجیب قسم کے شکوک پیدا ہونے لگے ۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ ڈاکؤں نے اس گھر پر حملہ کیا ہے اور ایک عورت بھی انہی کی ساتھی ہے ۔ وہ چپ چاپ پڑا آنکھیں پھاڑے انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ تاہم اس نے اپنی ظاہری حالت ایسی رکھی گویا وہ بےخبر سو رہا ہے ۔

جس کمرے میں اس کی اور زہرہ کی خواب گاہ تھی اس سے متصل ہی ایک اور کمرہ تھا ۔ اس کمرے میں ایک لوہے کے بکس میں زہرہ کے کپڑے اور زیورات رکھے ہوئے تھے ۔ زیورات کم و بیش بیس ہزار روپیہ کی مالیت کے تھے ۔ زہرہ نے بارہا عارف سے اصرار کیا تھا کہ وہ زیورات کے بکس کو رسول پور پہنچادے کیونکہ یہ گھر محفوظ نہ تھا ۔ مگر عارف نے سنی ان سنی کردی تھی ، اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سارا زیور بلکہ گھر کی ساری دولت تمہارے ہی مبارک قدموں کی وجہ سے ہمیں ملی ہے ۔ اگر یہ زیورات چوری بھی ہوجائیں تو مجھے کچھ پروا نہیں ۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ تمہیں کوئی چور مجھ سے چوری کر کے نہیں لے جا سکتا ۔ مناسب یہی ہے کہ تمہارے کپڑے اور زیور سب تمہارے ہی پاس رہیں ۔ پھر بڑے اطمینان کی بات یہ ہے کہ تمہارے والد اس علاقے کے پیر صاحب ہیں اور سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں اس لئے اس گھر کی طرف تاکنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوسکتی ۔

عارف کو خود اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا جب اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ عورت جو کمرے سے زیورات لے کر

باہر نکلی وہ کوئی دوسری عورت نہ تھی خود اس کی اپنی ساس اور زہرہ کی والدہ ہی تھی۔ دو ہی دن پہلے ایک طوفانی ہوا سے اس کمرے کی چھت کا ایک معتدبہ حصہ اڑ گیا تھا اور اڑے ہوئے جھروکوں میں سے چودھویں کے چاند کی چاندنی نے چھن چھن کر کمرے کو بھی اپنی شعاعوں سے منور بنا رکھا تھا۔ عارف کو کمرے کی ہر چیز صاف نظر آتی تھی۔ ان کی خوشدامن زیورات کی گٹھری بغل میں دبائے جب کمرے سے باہر نکل رہی تھیں تو عارف یہ سوچ رہا تھا ــ الٰہی! کیا یہی دنیا ہے؟ وہ تو اپنی خوش دامن کی اپنی ماں سے بھی زیادہ اس لئے عزت کیا کرتا تھا کہ وہ زہرہ کی والدہ محترمہ اور پیر صاحب کی زوجہ مکرمہ تھیں۔ ایسی ماں کے ایسے کرتوت دیکھ کر آس کے دل پر اب اس کی طرف سے اماوس کے ظلماتی بادلوں سے بھی زیادہ تاریک اور سیاہ پردے نفرت اور حقارت کے پڑ گئے۔ وہ رات بھر سوچتا رہا ــ کیا یہ دنیا اتنی ہی بدصورت اور گھناؤنی ہے؟

اب اس نے کوئی حرکت نہ کی بلکہ خاموش لیٹا رہا۔ آس نے دیکھا کہ آس کی خوش دامن کے پیچھے ہی پیچھے خود اس کے خسر صاحب بھی تلوار ہاتھ میں لئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ جب وہ دونوں کمروں سے نکل کر صحن میں آگئے تو اس نے چپ چاپ آٹھ کر دیکھا کہ اس کا پچھلا خیال غلط نہ تھا۔ واقعی وہ دونوں اس کے ساس سسر ہی تھے۔

عارف کو یہ معلوم تھا کہ اس کے خسر کی پچھلے کچھ دنوں سے مالی حالت خراب ہوگئی تھی۔ ملک قحط زدہ تھا اور افلاس نے تمام علاقے کی حالت تباہ کر رکھی تھی۔ زہرہ کے والد اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ انہوں نے گھر کے برتن تک گرو رکھ کر

اپنی ضروریات پوری کی تھیں . اسے یہ باتیں زہرہ کی زبانی معلوم ہوچکی تھیں. وہ اپنے ہی اعزہ خصوصاً محبوب زہرہ کے والدین کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھی تھا . اس نے چپ چاپ ان کی مالی امداد کرنی چاہی مگر وہ کسی طرح داماد کی مدد قبول کرنے پررضامند نہیں ہوئے . اس نے زہرہ کی معرفت بھی کچھ پیش کش کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا . چونکہ وہ کسی طرح بھی ان کی مالی امداد نہ کر سکا اس لئے اسے بے حد افسوس تھا.

زہرہ اپنی خراب صحت کی حالت میں بے خبر سو رہی تھی. عارف نے اسے بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا . خوف، غصے اور نفرت کی وجہ سے البتہ آسے خود نیند نہ آسکی .

صبح ہوتے ہوتے ایک ذرا اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی کی گریہ وزاری نے اسے جگا دیا . اس نے دیکھا کہ اس کی ساس چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہی تھی اور یہ بیان کررہی تھی کہ چوروں نے اسے برباد کردیا . اب وہ کیسے منہ دکھا سکے گی. بیٹی داماد کے سامنے وہ کیسے سر اونچا کرسکے گی. وغیرہ وغیرہ۔ زہرہ بھی چیخ پکار سن کر اٹھ بیٹھی . چوروں کی حقیقت سن کر وہ حیران اور پاگلوں کی طرح ایک ایک کا منہ دیکھتی رہی .

اب عارف اور زیادہ برداشت نہ کرسکا . آفتاب کی کرنوں نے اب اس کے دل سے خوف کی کرنوں کو دور کردیا تھا . اس نے کمرے سے نکل کر ایک چیخ کے ساتھ کہا ــ اماں ، اب زیادہ شور و غل نہ مچائیے . مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ زیورات کس نے چرائے ہیں . اگر میں چاہوں تو ابھی چوروں کو پکڑ بھی سکتا ہوں .

عارف کی زبان سے یہ حقیقت آمیز الفاظ سنتے ہی زہرہ کے

والدین پر جیسے ایک بجلی گر پڑی ــ وہ خاموش ہوکر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے . عارف نے اسی وقت زہرہ کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہوجانے کا فیصلہ کرلیا . مگر زہرہ کے والد نے داماد کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا ــ بیٹا، بتاؤ چور کون ہے ؟ کیا تم نے دیکھا ہے ؟ واقعی تم نے اسے دیکھا ہے ؟

عارف نے طنز آمیز ہنسی کے بعد کہا ــ جی ہاں ، دنیا کلجگ ہے اور یہ چودھویں صدی ہے اس لئے اب جو بھی نہ ہو تھوڑا ہے . اب تو خود چورہی مالک کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے

چہ دلا و داست ذردے کہ بکف چراغ دارد .

خسر پر جیسے بجلی گر پڑی . ان کے دل کو سخت دھکا لگا اور انہوں نے عارف کا ہاتھ چھوڑ دیا . عارف نے زہرہ کو ایک طرف لے جا کر رات کی ساری سرگذشت بیان کردی . اشاروں ہی اشاروں میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ زہرہ کہیں اس میں تمہارا بھی تو ہاتھ نہیں ؟ زہرہ یہ سنتے ہی بے ہوش ہوگئی . کچھ دیر کے بعد بڑی کوششوں سے جب اسے ہوش آیا تو عارف نے کہا ــ اب اس گھر میں رہنا میرے لئے حرام ہے . میں ابھی چلا جاؤں گا . ایسے جہنم کدے میں اب میں ایک منٹ بھی نہیں رہوں گا .

خسر اور خوش دامن تو جیسے پتھر کی مورت بن گئے تھے . وہ اس قدر حواس باختہ تھے کہ زہرہ کی بیہوشی بھی انہیں متاثر نہ کرسکی . اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں بھی عارف ہی نے کیں . ماں باپ نے اس کی طرف نظر بھی نہ اٹھائی .

عارف نے جب جانے کی تیاری کی تو زہرہ نے اس کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے کہا ــ مجھے بھی لے چلو ، مجھے اس جہنم

میں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا گواہ ہے میں بے قصور ہوں۔ مجھے یہاں چھوڑ کر سزا نہ دو۔ یہ کہہ کر زہرہ بے اختیار رونے لگی۔

عارف زہرہ کی بے قراری دیکھ کر آمادہ ہوگیا کہ اسے بھی کلکتہ لے جائے۔ عارف نے زہرہ سے کہا کہ وہ اب اپنے ماں باپ سے اس معاملے میں مزید پوچھ گچھ نہ کرے اور وہ خاموش ہوگئی۔

(۴)

رخصت کے وقت زہرہ کے والدین نے بیٹی اور داماد کا ہاتھ پکڑ کر رونا شروع کردیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ بغیر کچھ کھائے پئے نہار منھ وہ کسی طرح بیٹی داماد کو گھر سے جانے نہ دیں گے۔ کم سے کم ناشتہ ہی کرلیں۔ عارف نے بداخلاق بن کر ضعیف العمر بزرگوں کو بالکل ٹھکرا دینا پسند نہ کیا۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ اسے اس گھر کے پانی سے بھی نفرت تھی۔ بھلا کھانا کس طرح کھاتا۔ پھر بھی بد اخلاقی کے داغ سے بچنے کے لئے وہ ناشتہ کر لینے پر راضی ہوگیا۔ اس نے آج یہ بھی آزمانا چاہا کہ آخر انسان کہاں تک اپنی مکاری میں کمال دکھا سکتا ہے۔

زہرہ نے ہزار ضد کی کہ وہ اس گھر کا ایک قطرہ پانی بھی نہ پئے لیکن عارف کے اقرار اور اصرار سے وہ مجبور ہوگئی۔ تاہم اپنے متعلق اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ خود ہرگز کچھ نہ کھائے گی۔ اس نے اپنا قول نبھایا اور واقعی ایک قطرہ پانی بھی نہ پیا۔ ہاں عارف نے ناشتہ کر لیا۔ ناشتہ کئے ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ عارف کو بار بار قے ہونے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر زہرہ کے ہوش و حواس بجا نہ رہے اور وہ یکلخت بے ہوش

ہو کر گر پڑی ۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بس ایک لفظ کہا تھا ــ "ڈائن ۔"

عارف سمجھ گیا تھا کہ اسے کیا کھلایا گیا ہے ۔ اس نے طے کرلیا کہ بہر حال وہ سسرال میں نہیں رہے گا ۔ کم سے کم وہ اپنی موت کا قصہ اپنے ماں باپ کو سنا کر مرے گا ۔ یہ سوچ کر وہ بے تحاشہ اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگا ۔

اسٹیشن پہنچتے ہی اس کی حالت دگرگوں ہوگئی اور اسے بار بار خون کی قے ہونے لگی۔ وہ اسی حالت میں چلتی ہوئی ٹرین پر کسی طرح سوار ہوگیا ۔ اسٹیشن ماسٹر چیختا ہی رہ گیا مگر وہ ایک درجے میں گھس گیا ۔ درجے کے اندر سے انگریزی لباس میں ملبوس ایک بنگالی بابو نے بھی چیخ کر کہا ــ یہ اول درجہ ہے اتر جاؤ ، اتر جاؤ۔ عارف جواب نہ دے سکا مگر اسے گاڑی ہی میں ایک خون کی قے ہوگئی ۔

اسے حسن اتفاق کہئے یا عارف کی خوش نصیبی کہ ٹرین کے اس ڈبے میں جو بنگالی بابو سوار تھے وہ کلکتہ کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ عارف نے شکستہ آواز میں اتنا کہا ــ مجھے زہر دیا گیا ہے ۔ میرے . . . بس اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب تحصیل کے ایک بڑے زمیندار کی دعوت پر دیہات تک گئے تھے ۔ اور اب کلکتہ واپس جا رہے تھے۔ انھوں نے فوراً ہی دواؤں کے بکس کا معائنہ کیا ۔ خوش قسمتی سے انہیں ایک مناسب دوا مل گئی اور امتحان و تشخیص کے بعد انھوں نے عارف کو تابڑ توڑ کئی انجکشن دئے۔ دو تین انجکشن کے بعد ہی عارف کی طبعیت سنبھل گئی اور قے بند ہو گئی ۔

پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے سوچا تھا کہ وہ گاڑی روک کر

عارف کو اتار دیں گے مگر اب انھوں نے عارف کے علاج میں گہری دلچسپی لینی شروع کردی۔ خوش نصیبیاں ہمیشہ انجان راستوں ہی سے آیا کرتی ہیں۔

کلکتہ پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے عارف کو ہسپتال میں داخل کرادیا اور وہاں باقاعدہ اس کا علاج ہونے لگا۔

زہرہ اس واقعے کے بعد بالکل پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگی۔ وہ یقین کرچکی تھی کہ اب عارف آسے اس زندگی میں نہ مل سکے گا۔ آسے کیا خبر تھی کہ عارف کو خدا نے موت کے منھ سے واپس بھیج دیا تھا۔ اک ذرا ہوش میں آنے ہی جب اسے معلوم ہوا کہ عارف وہاں سے روانہ ہوچکا ہے تو اس نے دیوانوں کی طرح رونا پیٹنا شروع کردیا۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاؤں پر گر کر پچھاڑیں کھاتی اور کہتی تھی کہ مجھے رسولپور پہنچا دو۔

اس شوروغل کو سن کر پڑوسی جمع ہو گئے اور صورت حال سے ناواقفیت کی بنا پر وہ زہرہ کے والدین سے حقیقت حال دریافت کرنے لگے۔ زہرہ کے والدین نے سب لوگوں کو سمجھا دیا کہ زہرہ کے سارے زیورات رات چوری ہو جانے کی وجہ سے دامار تو پولیس کو خبر دینے گئے ہیں اور لڑکی اس غم میں دیوانی ہو چکی ہے۔

پیر صاحب کی بددعا اور ناراضی کے خوف سے لوگوں نے اور کچھ پوچھ گچھ نہ کی اور اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

(۵)

جب تین شبانہ روز زہرہ نے ایک ہی حالت میں رو رو

کر گزار دئیے اور پانی کا ایک قطرہ بھی اس کے حلق کے نیچے نہ اترا تو مجبور ہو کر اس کے والدین نے ایک پالکی میں سوار کر کے اسے رسولپور بھیجدیا اور خود حج کرنے کی نیت کر کے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ زہرہ اسی روز شام کو وہاں پہنچی جس دن کی صبح کے وقت عارف موت کے ہاتھوں سے رہائی پا کر ایک موٹر پر کلکتہ سے گھر آیا تھا۔

عارف نے اپنے والدین سے کچھ نہ کہا۔ وہ تین دنوں تک موت وحیات کی کشمکش میں برابر یہ سوچتا رہا کہ اگر اس کے والدین پر یہ راز ظاہر ہوگیا تو وہ ہرگز زہرہ کے والدین کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح زہرہ کے والدین کے ساتھ ساتھ اسے اپنے ماں باپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اور اس طرح دونوں گھرانے تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔

زہرہ، زہرہ، ان چار حرفوں میں اسے تمام جہاں کی مٹھاس اور چاند اور سورج کی مجموعی روشنی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے والدین کی بربادی کو بھی اپنی بربادی سمجھتا تھا۔ اس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی قسمت کے سوا اور کسی کو بھی اس کا قصوروار نہ ٹھہرائے گا۔ ان تمام مصیبتوں کی ذمہ دار خود اس کی تقدیر تھی۔ وہ نہ زبان سے کسی کو مجرم کہے گا اور نہ دل میں کسی کو خطاوار سمجھے گا۔

بیٹے کا ہلدی جیسا بد رنگ چہرہ دیکھ کر ماں باپ دھک سے رہ گئے۔ وہ صورت سے برسوں کا مریض معلوم ہوتا تھا۔ آخر ان کے پریشان کن استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ اچانک ایشیاٹک کالرا میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ تو اس کی زندگی

تھی کہ وہ موت کے ہاتھوں سے بچ نکلا اور زندہ کلکتہ سے گھر آگیا۔

ماں باپ نے عارف کو گلے سے لگایا اور روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ سیکڑوں فقیروں کو کھانا کھلایا گیا اور نہ جانے کتنے صدقے اتارے گئے۔ اس شب بڑے دھوم دھام سے محفل میلاد منعقد کی گئی۔

ابھی آفتاب غروب نہ ہوا تھا کہ عارف کے دروازے پر زہرہ کی پالکی پہنچی۔ زہرہ نیم مردہ حالت میں کسی طرح پالکی سے اتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے قدم ہزار ہزار من کے ہوگئے تھے وہ دل ہی دل میں سوچتی تھی کہ وہاں پہنچ کر اسے نہ جانے کیا کیا سننا پڑے گا۔ اندر قدم رکھتے ہی اسے سب سے پہلے عارف نظر آیا۔ زہرہ بے اختیار دوڑ کر اس کے پاؤں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بار بار چیختی اور کہتی رہی۔ "آپ آگئے۔ آپ بچ گئے؟ اے خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر" یہ کہتے کہتے وہ بیہوش ہوگئی۔ گھر والے اس کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگے۔ اسے دوڑ کر اٹھایا اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ عارف کے والدین نے اس کے ہوش میں آنے پر کہا — تم دونوں آخر یہ کس حال میں ہو؟ معلوم ہوتا کہ قبروں سے اٹھ کر چلے آرہے ہو۔ بات کیا ہے بتاؤ تو؟ ساس نے رو رو کر تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ وہ بار بار کہتی تھیں — میری اس سونے کی گڑیا کو کیا ہوگیا؟ اسے کس حاسد کی نظر بد نے تباہ کر دیا۔ غرضکہ سارا گھر مسرت اور غم کے ملے جلے جذبات سے ایک محشر کدہ بنا ہوا تھا اور سب ہی خوشی کے آنسو بہا رہے تھے۔

عارف نے زہرہ کو تنہائی میں سب باتیں صاف صاف بتا

دیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب کسی پر الزام دھرنا لا حاصل ہے۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ بچ کر نکل آئے۔ زہرہ عارف کی اولوالعزمی اور ہمت مردانہ پر عش عش کر اٹھی پھر بھی اس نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا ــ میں بھی ضرور مجرم ہوں کیونکہ میں ایسے بدطینت اور کمینے ماں باپ کی بیٹی ہوں۔ میرا سر شرم و ندامت سے نہیں اٹھ سکتا۔ آپ مجھے جو سزا چاہیں دے سکتے ہیں۔ میں ہر سزا ہنسی خوشی برداشت کروں گی۔ آپ نے میرے ماں باپ کی بے ایمانی پر پردہ ڈال کر مجھے اور زیادہ زخمی کیا ہے۔ یہ زخم ناقابل برداشت ہے۔ آپ لوگ بجا طور پر مجھ سے نفرت کر سکتے ہیں کیونکہ میں ایک کمینہ خصلت والدین کی بیٹی ہوں۔

عارف نے زہرہ کو سینے سے لگالیا اور اسے ہر طرح سے تسلی اور تشفی دے کر خاموش کیا۔ زہرہ پھر بھی شرمسار تھی اور عارف نہایت سر بلند اور مسرور۔ اس کے دل میں زہرہ کی سچی محبت تھی اور وہ اسے واقعی بے قصور سمجھتا تھا۔ اسی طرح زہرہ بھی اس کی محبت کی دیوانی اور دل سے اس کی حوصلہ مندیوں کی قدرشناس تھی۔

(٦)

مصیبتوں کی آندھیوں اور پریشانیوں کے ان طوفانوں میں بھی زہرہ اپنے کلغی دار سانپوں کو نہ بھولی تھی۔ وہ اتنے دنوں تک خاموشی کے ساتھ ان ناگوں کو گوشۂ دل میں زندہ لئے ہوئے تھی جس طرح اس کے جڑواں بچے اس کے خواب کی دنیا آباد کئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بھول بھی کیسے سکتی تھی؟ اسی غم اور فکر نے تو اسے آج موت کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔ وہ تو

اپنے آپ کو ایک سپیرا یا سپیرن کی لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً جب سے اس کے ماں باپ نے عارف جیسے فرماں بردار، غمخوار اور شریف الطبع داماد کی زہر سے تواضع کی تھی اس وقت سے وہ اپنے گھروالوں کو بدترین انسان سمجھنے لگی تھی۔ آخر وہ اپنے آپ کو سپیرن کیوں نہ سمجھتی ابتو وہ بیداری میں بھی ان سانپوں ہی کے خواب دیکھا کرتی تھی اور اپنی راتیں انھی کی آغوش میں گذارتی۔

رسول پور پہنچ کر اس نے کسی سے بھی ان سانپوں کے بارے میں نہ پوچھا۔ پوچھتی بھی تو کیسے۔ انہیں کے کارن تو اسے اس گھر سے رخصت ہونا پڑا تھا۔ ساس سسر نے بھی اک ذرا اطمینان کا سانس لیا اور سمجھا کہ زہرہ اتنے دنوں میں ان سانپوں کو بھول چکی ہے۔

ایک سنسان رات میں زہرہ نے ایک خواب دیکھا کہ اس کے دونوں جڑواں بچے اس کے پاس آگئے ہیں اور بسور بسور کر کہہ رہے ہیں ــ اماں ہم بہت بھوکے ہیں۔ اماں بولو تو ہم سے کیوں ناراض ہو؟ تم نے ہمیں کتنے دنوں سے دودھ نہیں پلایا۔ ہم قبروں میں لیٹے دودھ کی آس میں دم توڑ رہے ہیں۔ اب تو اٹھنے کی بھی سکت نہیں۔ اماں ہم سے ناراض نہ ہو۔ بتاؤ ہمارا کیا قصور ہے؟ اک ذرا دودھ دو نہ اماں! ہمیں بڑی بھوک لگی ہے۔ ہائے بھوک۔ ہائے پیاس۔

زہرہ نے ایک چیخ ماری ــ ہائے میرے بچے! اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے کانوں میں اب بھی ان بچوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی ان کمزور بچوں کی نیم جاں صورتیں ناچ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں

سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑےاور وہ زار و قطار رونے لگی. اس نے دیکھا کہ عارف گہری نیند میں محو خواب ہے . چپکے سےاس نے روشنی کی لو بڑھائی اور ہر طرف کچھ تلاش کرنے لگی. جیسے وہ اپنے بچوں ہی کو ڈھونڈھ رہی ہو مگر وہاں اسے کچھ بھی نظر نہ آیا .

پاگلوں کی طرح دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گئی . گھر کے سامنے ہی میر صاحب کا خاندانی قبرستان تھا . زہرہ اپنے ہوش میں نہ تھی . آج وہ حقیقی معنوں میں ایک غمگین ماں نظر آرہی تھی ، ایک محروم اولاد ماں . ایسی ماں جس کی کوکھ اجڑ چکی ہو . اس کے گم شدہ بچوں نے اسے آواز دی تھی وہ چھ مہینے کے بھوکے پیاسے تھے . اس کے کانوں میں یہ آوازیں گونج رہی تھیں ــ اماں بڑی بھوک لگی ہے . ہم سے ناراض نہ ہو . اک ذرا سا دودھ دو .

زہرہ آگے بڑھی . دو جڑواں قبریں سامنے تھیں . لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے اپنے بچوں کی قبریں مل گئیں . اسے ان کے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی . زہرہ نے خود اپنے ہاتھ سے گلاب کی دو شاخیں ان قبروں پر لگائی تھیں. اب ان میں لال لال پھول کھلے ہوئے تھے. وہ ان پھولوں کو دیکھ کر اپنے پھول جیسے بچوں کو کیسے بھول جاتی . بچوں کی قبروں پر احمریں رنگ کے پھول مرجھائے ہوئے تھے . شاید وہ اس کے دل کا خون چوس چوس کر رنگین ہو گئے تھے .

بد نصیب ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی. میرے لال، میرے بچے ، ہائے تم کہاں ہو ؟ میں تمھیں دودھ پلانے آئی ہوں . میرے بچو ، میری پکار کا جواب دو . مجھ سے نہ روٹھو . آؤ ، آؤ

میرے سینے سے لگ جاؤ۔ یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار دونوں قبروں پر گرکر آنسو بہانے لگی۔ روتے روتے نہ جانے کب تک وہ ان قبروں پر بے ہوش پڑی رہی۔ دیر کے بعد جب صبح کی ٹھنڈی ہوا اسے ہوش میں لائی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے دیکھا کہ اس کے سینے سے لگے کنڈلی مارے دونوں کلغی دار ناگ بھی آرام کر رہے ہیں۔

زہرہ دیوانوں کی طرح چیخ کر بولی—میرے بچو، میرے لال تم آگئے؟ تم اپنی ماں کو نہیں بھولے؟ تم اس بدقسمت ابھاگن کو چھوڑ کر ناراض تو نہیں ہوئے؟ آؤ میرے لال، آؤ میرے بچے۔ یہ کہہ کر زہرہ نے ان دونوں کو گود میں اٹھا لیا اور بے اختیار انہیں اپنے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی وہ سانپ بھی اس سے اس طرح مل رہے تھے جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے بچے اپنی ماں سے مل رہے ہوں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے گلے میں اس طرح لپیٹ لیا جیسے پیار کرنے والے بچے اپنی باہیں ماں کے گلے میں ڈال کر جدائی کا قصہ بیان کرتے ہیں۔

زہرہ نے دیکھا کہ وہ سانپ مرجھائے ہوئے ہیں۔ ان کے جسم سوکھ گئے ہیں۔ وہ دودھوں کھایا بدن اب اور باقی نہیں ہے۔ وہ ناگ بار بار اپنی زبانیں باہر نکال نکال کر کے زہرہ سے اپنی پیاس اور اپنی بھوک کی داستان غم بیان کر رہے تھے اور اس کے ہاتھوں کو اپنی زبانوں سے چاٹتے تھے۔ وہ اپنا حال دل زبان بے زبانی سے بیان کر رہے تھے۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی — اماں، بڑی بھوک لگی ہے۔ اک ذرا دودھ پلا دو، ہائے بھوک۔ اس نے کہا—ہائے تمہیں کسی نے کھانے کو نہ دیا۔ میرے بچو! بھلا میرے نہ رہتے کون تمہارا خیال کرتا۔

زهرہ انہیں سینے سے دبائے گھر واپس آئی ۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت تک نیند سے کوئی بیدار نہ ہوا تھا ۔ اس نے گھر میں جا کر دیکھا کہ دیگچی میں دودھ رکھا ہوا تھا ۔ اس نے فوراً تھوڑا دودھ ایک برتن میں لا کر سانپوں کے سامنے رکھ دیا ۔ وہ بھوکے بھکاریوں کی طرح بے قرار ہو کر اس پر ٹوٹ پڑے اور مزے لے لے کر اس طرح دودھ پینے لگے جیسے وہ مدتوں کے بھوکے پیاسے ہوں ۔

زہرہ انہیں اس طرح دودھ پیتے دیکھ کر آنکھوں سے گنگا جمنا بہانے لگی ۔ یہ مسرت اور محبت کے آنسو تھے ۔

آہٹ پا کر عارف کی والدہ اٹھیں ۔ انہوں نے بہو کے یہ کرتوت دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبالی اور زہرہ کو مخاطب کر کے کہا ــ بیٹی یہ بلائیں چھ مہینے سے خدا جانے کہاں غائب تھیں. تمہیں دیکھتے ہی پھر اس گھر میں واپس آ گئیں ۔ انہیں شاید تمہارے جسم کی مہک کھینچ لائی ہے.

زہرہ نے بڑے مجروح دل اور غمگین آواز سے کہا ــ اماں! وہ بلائیں نہیں وہ تو میرے بچے ہیں. ساس نے اس کا مطلب کچھ بھی نہ سمجھا ۔ انہوں نے ہنس کر کہا ــ واقعی بیٹی ، وہ تم کو بچوں ہی کی طرح مانتے ہیں. تمہارے چلے جانے کے بعد دو ایک بار ہم لوگوں نے انہیں دودھ دیا تھا مگر تم سن کر تعجب کرو گی کہ انہوں نے منہ تک نہ ڈالا، تمہیں تلاش کر کے وہ باہر چلے گئے. سانپ بھی آدمی کو پہچانتے ہیں اس کلجگ میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ۔

سانپوں نے جی بھر کر دودھ پیا اور پھر زہرہ کے قدموں کے پاس آ کر چپ چاپ سو گئے ۔

(۷)

اسی دن رات کے پہلے ھی پہر ایک خادمہ نے شور مچایا۔ دوڑو، دوڑو، بھوت آیا۔ بھوت آیا۔ جنوں کا بادشاہ آیا۔ سارے گھر میں ایک ھنگامہ برپا ھو گیا اور وہ ملازمہ بیہوش ھوگئی۔

عارف کی والدہ اس وقت عارف سے کہہ رھی تھیں۔ عارف، تم نے مجھے ذرا بھی نہ بتایا کہ زھرہ پورے دنوں سے ھے۔ اسے تو درد شروع ھوگیا ھے۔ عارف نے کہا۔ اماں، ابھی تو ساتواں مہینہ ھے۔ ابھی درد شروع ھونے کا کیا وقت ھے؟ ابھی یہ باتیں ھو ھی رھی تھیں کہ سارے گھر میں جن اور بھوت کا شور مچا۔

گھر کی سب خادمائیں اور ملازم کہنے لگے کہ انھوں نے اک ذرا پہلے ھی دروازے کے قریب ایک بھوت کو دیکھا تھا۔ زندہ بھوت۔ تاڑ کی طرح لما۔ سامنے آم کے درخت کے قریب کھڑا نظر آیا تھا۔ غرضکہ ایک عجیب طرح کا ھنگامہ اور شور و غل ھونے لگا۔ عارف اور اس کی ماں لالٹین لئے باھر نکل آئے۔ انھوں نے بھی دیکھا کہ ایک مرد درخت کے نیچے کھڑا ھے۔ لیکن انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ ان کے پیچھے زھرہ بھی بھوت دیکھنے چلی آئی تھی۔

اچانک ایک بڑی خوفناک چیخ درخت کی جانب سے آئی۔ یہ آواز اسی شخص کی تھی جو درخت کے پاس کھڑا تھا۔ ارے باپ رے باپ۔ سانپوں نے مار ڈالا۔

زھرہ بھی زور سے چیخی۔ میرے ابا، میرے ابا! عارف کی والدہ نے بھی کہا۔ یقیناً یہ سمدھی ھی ھیں۔ مگر پھر زھرہ چیخنے لگی۔ یہ واقعی بھوت ھے۔ میرا باپ نہیں ھے۔ خطرناک بھوت

ہے . اسے مارو ــ مار کر گھر سے نکال دو . یہاں مت آنے دو .

یک بیک زہرہ کو ایسا معلوم ہوا کہ وہی آدمی لاٹھی سے بے تحاشہ کسی چیز کو بڑی بے دردی سے مار رہا ہے . مارتے مارتے اس نے پھر ایک چیخ ماری ــ ارے باپ رے، سانپوں نے ڈس لیا، ہائے رے سانپوں نے مار ڈالا .

زہرہ نے دیوانوں کی طرح اپنی ساس کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور بجلی کی طرح اس درخت کی طرف دوڑی ــ وہ چیختی رہی، ہائے یہ بیدرد بھوت میرے بچوں کو مارے ڈالتا ہے . لوگوں بچاؤ میرے بچوں کو بچاؤ ــ" زہرہ کے ساتھ ساتھ اور لوگ بھی دوڑے، وہاں جاکر ان لوگوں نے دیکھا کہ واقعی طور پر وہاں بھوت تو نہ تھا بلکہ زہرہ کے والد ہی تھے جو پورے زور کے ساتھ لاٹھی چلا رہے تھے اور بڑی بے دردی کے ساتھ سانپوں کو مار رہے تھے . وہ دونوں سانپ بھی انہیں جابجا سے ڈس کر بری طرح مجروح کر رہے تھے .

زہرہ ایک بار ــ ہائے میرے بچے اور دوسری بار ہائے میرے ابا کہہ کر زمین پر گر پڑی اور بیہوش ہو گئی. جب اسے ہوش آیا تو زہرہ نے عارف کو بلایا اور سب سے درخواست کی کہ آپ سب یہاں سے ہٹ جائیں. پھر تنہائی میں اس نے پوچھا ــ میرے بچے کہاں ہیں؟ میرے تاج دار بچے، اور ہاں میرے باپ کا کیا حشر ہوا؟

عارف نے روتے ہوئے جواب دیا ــ زہرہ ! یہ دنیا فانی ہے . افسوس دونوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں . سب ہی رخصت ہو گئے . سانپوں کے زہر سے تمہارے والد نے وفات پائی اور تمہارے والد کی لاٹھیوں نے ان سانپوں کو ختم کردیا . کلکتہ میں تمہاری والدہ کو ہیضہ ہوگیا تھا اور وہ بھی جانبر نہ ہو سکیں . تمہارے

والدین حج کی نیت سے گھر سے روانہ ہو کر کلکتہ گئے تھے۔ تمہارے والد تم سے ملاقات کے لئے یہاں آئے تھے۔ افسوس کہ ان کی عمر پوری ہوگئی تھی اور یہ سانپ ہی ان کی قضا بن گئے۔

زہرہ نے کہا ــ" اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک"۔ عارف نے کہا ــ ادھر تمہاری والدہ ہیضہ سے وفات پا گئیں۔

زہرہ بولی خوب شد۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ میرے دونوں بچے کہاں ہیں؟ دونوں تاجدار سانپ آہ، میرے دل کے ٹکڑے، وہ کہاں ہیں۔

عارف نے کہا ــ زہرہ بے قوار نہ ہو۔ صبر کرو۔ تمہارے والدنے انہیں نہ چھوڑا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہاتھوں ختم ہوگئے۔ خدا کی مرضی میں کیا چارہ ہے۔

زہرہ نے کہا ــ کیا میرے بچے اب زندہ نہیں ہیں؟ وہ ختم ہو گئے! یہ کہتے کہتے وہ بیہوش ہوگئی۔ صبح ہوتے ہوتے تمام گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ میر صاحب کی سونے کی گڑیا جیسی بہو ایک جوڑے مردہ سانپ کو گود میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

ڈاکٹر محمد شہیداللہ

۱۸۸۵ء میں موجودہ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ کے موضع پیارا گرام میں ڈاکٹر محمد شہیداللہ پیداہوئے- بہت ساری زبانوں کے ماہر اور ادیب کی حیثت سے ڈاکٹر شہیداللہ عظیم شہرت کے مالک ہیں . ۱۹۱۰ء میں انھوں نے کلکتہ سٹی کالج سے سنسکرت میں آنرس کے ساتھ بی اے پاس کیا . پھر انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے لسانیات میں ایم اے پاس کیا . پھر فرانس کی یونیورسٹی سے انھوں نے دو اعلیٰ درجے کا ڈپلوما حاصل کئے . وہ سنسکرت، فارسی، پراکرت، عربی، عبرانی، آبستان، تبتی، فرانسیسی، میتھلی، ہندی، اردو، پشتو، دکھنی، آسامی، اڑیا وغیرہ زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں . لسانیات کے علاوہ ادب کے مختلف اصناف میں بھی ڈاکٹر محمد شہیداللہ کی تصنیفات کثیر ہیں . انھوں نے دیوان حافظ، رباعیات عمر خیام، شکوہ وجواب شکوہ وغیرہ کتابوں کے بنگلا میں تراجم پیش کئے ہیں . علاوہ بریں انھوں نے بہت ساری علمی وادبی و تنقیدی کتابیں بھی لکھی ہیں . بہت دنوں تک وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ بنگلا و سنسکرت کی حیثیت سے کام کیا ہے - موجودہ وقت میں بنگال اکاڈمی میں صدر شعبہ ادارت کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہیں ہیں .

ڈاکٹر محمد شہیداللہ نے بہت سارے اصناف سخن وانواع ادب کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے اور نظمیں بھی لکھی ہیں .

بہشت کا خط

رحیم بخش خاں پنجابی پٹھان ہیں .
لڑائی ان کا آبائی پیشہ ہے .

اب کی بار تین مہینہ کی چھٹی پر وہ گھر آئے ہیں. کتنی تیزی سے چھٹی کے دن گذرتے جاتے ہیں . معلوم نہیں دنوں کے پر لگ گئے ہیں یا چھٹیوں میں گھڑی کی سوئی گھوڑے کی طرح دوڑتی چلی جاتی ہے . کبھی کبھی وہ یہی سوچتا ہے .

چھٹی ختم ہونے میں ابھی چار ہفتے باقی ہیں . یکا یک محکمہ سے ضروری تار پہنچا کہ اسے اسی دن روانہ ہونا پڑے گا . وہ سمجھ گیا کہ ضرور کہیں لڑائی شروع ہو گئی ہے اسی لئے تنگ طلبی ہے .

وہ کتنی بار لڑائی لڑچکا ہے. دو ایکبار زخمی بھی ہوا ہے. اس بار بھی وہ میدان میں جائے گا . اس میں دکھ کی کیا بات ہے؟ مگر اس کی چھ سال کی بچی آج کسی طرح اسے چھوڑنا نہیں چاہتی پانچ کوس راستہ چل کر اسے ریلوے اسٹیشن تک جانا پڑے گا . محض تین گھنٹے باقی رہ گئے ہیں . مگر لڑکی باپ کو چھوڑنا گوارا نہیں کر رہی ہے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے باپ کی انگلی اپنی بساط بھر مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے . گذشتہ دن اس نے باپ سے پوچھا تھا . اباجان اور کتنے دن چھٹی کے باقی ہیں

باپ نے اس کے دونوں ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں شمار کر کے اور پھر ہاتھ کی منجھلی انگلی پکڑ کے بتایا تھا کہ اتنے دن باقی ہیں۔ مگر وہ آج ہی جانے پر کیوں مصر تھا؟ رحیم بچی کو سمجھا نہ سکا۔ وہ کتنی بار میدان جنگ میں اپنی سنگین کے بل پر دشمن کو سامنے سے ہٹا چکا تھا۔ لیکن آج بچی کی انگلیوں سے اپنی انگلی نہ چھڑا سکا۔ آج اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔

لڑائی میں وہ کتنی بار دشمن کی قطار درہم برہم کر کے اپنی جماعت میں واپس آیا ہے۔ وہ کبھی حواس باختہ نہ ہوا۔ لیکن آج اس کا دماغ کام نہ کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی بیوی نے زبردستی بچی کو گود میں لے لیا۔ بچی رنج سے رونے لگی۔ رحیم نے اسے سمجھایا کہ جلد ہی وہ لڑائی سے گھر واپس آجائے گا۔ اور ہر روز اس کے نام خط لکھتا رہے گا۔

اب ٹھہرنے کا وقت نہ تھا۔ رحیم نکل کھڑا ہوا۔ بچی نے چلا کر کہا ــ ابا جان جلدی لوٹئے گا تو۔ رحیم نے بس "ہوں" کہا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھے۔

لڑکی اپنے گھر کے قریب ہی ڈاکخانے میں روزانہ اس انتظار میں جایا کرتی کہ شاید اس کے ابا جان کا کوئی خط آجائے۔ کسی دن خط ملتا اور کسی دن نہ ملتا جس روز وہ اپنے ابا جان کا خط پاتی اس روز اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ وہ اپنے باپ کا خط کسی طرح نہ چھوڑتی۔ سوتے وقت تکئے کے نیچے رکھ کر سوتی۔ جس دن ڈاکخانے کے منشی جی کہتے کہ نہیں آج تمہارے ابا کا کوئی خط نہیں آیا اس روز اس کا چہرہ افسردہ ہو جاتا۔ وہ اپنی اماں سے پوچھتی ــ اماں جان! ابا روز خط کیوں نہیں بھیجتے! اسے کیا خبر کہ میدان جنگ میں ایک سپاہی کی زندگی کیسی

ہوتی ہے !

دو مہینے گذر گئے ۔ اب کی بار ایک ہفتے تک رحیم کا کوئی خط نہ آیا ۔ بچی روزانہ ڈاکخانہ سے محروم لوٹ آتی ۔ اس کا روز کا شگفتہ چہرہ بدلی بھرے آسمان کی طرح بڑا ملول تھا ایک ہفتے کے بعد رحیم کی بیوی کے نام ایک خط آیا ۔ اتنے دنوں کے بعد باپ کا خط ! جیسے روزے کے بعد عید کا چاند ۔ رحیم کی بیوی نے گھبرائے ہوئے ہاتھوں سے خط لیا۔ پتہ کسی دوسرے کے ہاتھ کا لکھا دیکھ کر ایک انجانے خوف سے اس کا دل کانپنے لگا۔ شوہر کے سوا اور کسی نے کبھی اسے خط نہیں لکھا ۔ یہ نہ جانے کس کا خط تھا۔ نہ معلوم کس کی خبر ؟ لفافہ کھول کر اس نے جو کچھ پڑھا اس سے دماغ پر ایک بجلی گر گئی ۔ ایک سپاہی کی بیوی ہوتے ہوئے بھی وہ اس ناگہانی خبر کے لئے تیار نہ تھی ۔ وہ زمین ہی پر بیٹھ گئی ۔ اس کا سر چکرانے لگا جیسے کہ ساری دنیا اس کی نگاہوں کے آگے سے مٹ گئی ہے ۔ بچی کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا اور وہ حیران کھڑی رہی۔ اتنی دیر تک بچی ہمت کر کے ماں سے کچھ دریافت نہ کر سکی تھی۔ اب اس نے پوچھا ــ اماں جان! تم ایسا کیوں کر رہی ہو ؟ وہ کچھ نہ بول سکی۔ بس بچی کو پیار کر کے اس نے ایک لمبی سانس لی اور بس ۔

بچی پھر بھی روز روز ڈاکخانے جایا کرتی مگر روز ہی مایوس ہو کر لوٹ آتی ۔ ایک دن اسے اپنے نام کا ایک خط ملا ۔ آج وہ بیحد خوش تھی ۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنی ماں سے کہا ــ اماں جان، ابا اتنی دیر سے کیوں خط لکھتے ہیں ۔ اب کی ابا گھر آئیں تو میں ان کے پاس نہ جاؤں گی ۔ ماں نے آہستہ سے وہ خط ہاتھوں میں لیا۔ اسے معلوم تھا کہ خط کس نے لکھا ہے اس نے وہ خط بچی کو

پڑھ کر سنایا .

بہشت سے ۔

جان پدر

تاریخ . . .

میری بہت بہت دعائیں لو۔ میں دنیا چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں. میری لڑائی ختم ہوگئی ہے . یہاں میرے ایک دوست ہیں . وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں. وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے. میں تم لوگوں کے یہاں جاکر کیا کروں گا وہاں کتنی تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں . یہاں کتنا سکھ اور کتنی مسرت ہے؟ میری جان! یہ میری آخری چٹھی ہے . اگر تم نیکی اختیار کرو تو ایک دن میرے یہاں آجاؤگی . یہاں آنے کے بعد پھر کبھی جدائی نہ ہوگی. ہم سب مل جل کر اسی دوست کے گھر میں رہیں گے . ہمیں نہ کوئی فکر ہوگی نہ غم ، نہ پریشانی اور نہ حیرانی. میں بڑے آرام سے ہوں . اب تمیں خط لکھنے کی ضررت نہیں ہے . میں یہاں رہ کر تم لوگوں کی خبریں پایا کرتا ہوں . فقط واسلام

رحیم بخش مرحوم مخفور.

بچی سب باتیں سمجھ نہ سکی . ماں نے اسے سمجھادیا . جب بچی کو معلوم ہوگیا کہ اب ابا واپس نہ آئیں گے تو اس نے ماں کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا ــ اماں جان ! ابا سے آنے کے لئے کہو۔ اب میں ان سے خفا نہ ہوں گی .

ماں نے منھ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں لینے لگی :

ابوالمنصور احمد

۱۸۹۸ء میں ابوالمنصوراحمد مرضع دھانی کھولا[ضلع میمن سنگھ میں تولد ہوئے . موجودہ بنگالی ادیبوں میں ابوالمنصور کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے . ملک کی سیاسی تحریکات سے مدت العمر عملی تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے ادب کی خدمت سے کبھی بھی پہلو تہی نہیں کی. تعلیمی زندگی ہی سے انھوں نے ادبی خدمات انجام دینا شروع کیں . ابتدا ہی سے انھوں نے الاسلام، سوغات، بنگلیو مسلمان شاھتو پتریکا وغیرہ رسالوں میں افسانے مظامین لکھنے شروع کئے. بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے خلافت کی تحریک میں حصہ لیا . وہ ایک کامیاب صحافی اور مدبر کی حیثیت سے بھی بڑی شہرت کے مالک ہیں . سلطان، محمدی، خادم، دی مسلمان، روزانہ کریشک،تبوجگ اور اتحاد وغیرہ اخبارات میں انھوں نے معاون مدیر کی حیثت سے بڑی شہرت حاصل کی — ۱۹۲۹ء میں ابوالمنصور نے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنےکےبعد میمن ضلع کی عدالت ججی میں وکالت شروع کی ۔ سماجی اصلاح کیلئے طنزیہ انداز تحریرمیں وہ بڑی مہارت کے مالک ہیں . ان کی کتاب ''آئنیہ،، نے ادبی حلقوں میں انھی خصوصیات کی وجہ سے بڑی عزت پائی ۔ آئینہ کی شہرت کے علاوہ ان کی ،،فوڈکانفرنس،، نام کی طنزیہ تحریر، ششوبتھا، جیبن‌کھودا نامی ناول اور چھوٹودیر قصص الانبیاء اور مسلمانی کتھا نام کی کتاب جو بچوں کے لئے لکھی گئی اس نے بڑی عزت اور شہرت پائی - فی‌الحال وہ علیل ہیں اور خاموش زندگی گذار رہے ہیں .

آدو بھائی

آدو بھائی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ وہ پڑھتے نہیں بلکہ پڑھا کرتے تھے۔

سبب یہ ہے کہ اس درجے کے سوا انھوں نے اور کسی درجے میں کبھی تعلیم نہیں پائی۔ ممکن ہے کہ انھوں نے پڑھا بھی ہو اور کسی طالب علم کو یہ خبر نہیں کہ وہ کبھی کسی اور درجے میں بھی پڑھتے تھے۔ غالباً اکثر اساتذہ کو بھی اس کی خبر نہیں۔

اکثر اساتذہ بھی انہیں آدو بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بھی ایک زمانے میں آدو بھائی کے ہم سبق تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ سب ہی اسی ساتویں جماعت میں ان کے ہم سبق رہے تھے۔

میں ساتویں جماعت میں آدو بھائی کا ہم سبق ہوا اس وقت بھی وہ درجے کی میز اور سیاہ تختہ کی طرح اس درجے کے سب سے پرانے طالب علم تھے۔ وہ غیر متبدل اور فطرۃ معتاد ہو چکے تھے۔

آدو بھائی کی اس ناکامیابی کے لئے دوسرے چاہے جتنا بھی مایوسی کا شکار ہوں مگر کبھی کسی نے خود انہیں مغموم نہ دیکھا اپنا نمبر بڑھانے کے لئے بھی انھوں نے کبھی کسی استاد یا ممتحن کی خوشامد نہیں کی۔ اگر کبھی کسی دوست نے کہا بھی کہ آدو بھائی

تمھیں معلوم ھے کہ چند مضامین میں تمھارے نمبر کم ھیں . کیوں نہیں ممتحن سے کہہ سن کر کچھ نمبر بڑھوالیتے ھو۔ اس پر بہت سنجیدہ ھو کر کہتے بھئی ــ ھر مضمون میں پختہ ھو کر ھی ترقی پانا بہتر ھے .

وہ کس کس مضمون میں پختگی یا نا پختگی کے منتظر ھیں اس کا علم کسی کو نہیں ۔ خود آدو بھائی بھی اس سے لاعلم ھیں. انھوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی-یہ سمجھنا بھی مشکل ھی ھے کہ انھیں یہ جاننے کی فکر بھی تھی یا نہیں . وہ تو یہ یقین کرتے کہ ایسے شوق کا اظہار بھی جرم اور امرمزموم ھے . وہ کہتے ــ جس دن وہ ھر مضمون میں کامیاب ھوجائیں گے اس روز ان کی ترقی کوئی روک نہ سکے گا . اس یقین میں کبھی کسی نے کمزوری نہیں دیکھی کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا اور آدو بھائی بھی ترقی پائیں گے .

کتنے نالائق لڑکے امتحان گاہ میں چوریاں کرتے ھیں یا دوسروں کے جوابات نقل کر کے کامیاب ھوجاتے ھیں بلکہ آدو بھائی کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی ھے اور کامیابی کا سہرا سر پر رکھ کر آگے بڑھ گئے ھیں لیکن اگر کوئی لڑکا آدو بھائی سے اشاروں میں بھی ایسی بات کہتا تو وہ گرج کر کہتے ــ ھم تو حصول علم کے لئے اسکول میں پڑھتے ھیں پروموشن کے لئے نہیں پڑھتے .

اسی لئے بہت سارے مشکوک دوستوں نے آدو بھائی سے دریافت بھی کیا ھے ــ کیا واقعی آپ پروموشن کی امید رکھتے ھیں ؟

ناقابل شکست یقین سے آدو بھائی کا چہرہ منور ھو گیا . انھوں نے عقیدتمندانہ انداز سے کہا ــ آج ھو یا کل ، مجھے

ترقی دینی ہی پڑے گی. مگر یہ سچ ہے کہ ترقی وہی بہتر جو آہستہ آہستہ ہو . جو درخت تیزی کے ساتھ بڑھ جاتا ہے اس کی شاخیں معمولی ہواؤں سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں .

یہی سبب ہے کہ آدو بھائی کو کبھی کسی نے پچھلی سیٹوں پر بیٹھے نہیں دیکھا . اگلی بنچ پر بیٹھ کر وہ استاد کی ساری باتیں پوری توجہ کے ساتھ سنا کرتے . منھ کھولے ہوں ، ہاں کرتے ہوئے سر ہلایا کرتے اور جہاں ضروری سمجھتے نوٹ بھی کرتے . کاپیوں کی تعداد اور ان کے سائز بھی آدو ہی کی مناسبت سے تھے . غرضکہ آدو بھائی ایک بڑے ہی نیک طالب علم تھے .

صرف درجے ہی میں نہیں بلکہ اسکول بھر میں وہ پہلے آپہنچتے اس معاملے میں کبھی کوئی استاد یا طالب علم انہیں کوئی شکست نہ دے سکا .

اسکول کے سالانہ تقسیم انعامات کے جلسے میں ہم نے ہمیشہ ان کو دو باتوں کا انعام لیتے دیکھا ہے. ہم نے یہ بھی سنا کہ کسی ناقابل یاد زمانے سے آدو بھائی برابر یہ دو انعام ہر سال وصول کرتے آئے ہیں . پہلا انعام بلا ناغہ حاضری کا اور دوسرا نیک چلنی کا . مضافات شہر کے خان موضع سے روزانہ پانچ میل راستہ وہ پیدل طے کر کے آتے . آندھی طوفان بیماری اور علالت کوئی بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوسکی. چیت کے مہینے کے موسمی طوفان یا ساون کے مہینے کی جھڑی میں بھی جب کہ کوئی حیوان یا پرندہ اپنے اپنے گھروں سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکتا اس دن بھی چھتری کے سائے میں جھکتے اور بچتے ہواؤں سے لڑتے اور طوفانوں سے بھڑتے آدو بھائی کو اسکول کے راستے میں آگے بڑھتے دیکھا گیا ہے . استاد اپنی تنخواہ کی خاطر ایسے موسم میں بھی اسکول آیا کرتے لیکن یقین

کے ساتھ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسے خراب موسم میں کوئی طالب علم حاضر نہ ہوگا اور جو آئے گا بھی وہ بس منہ دکھائے گا۔ مگر ایسے دن میں بھی ایک اندھیرے گوشے سے آداب سر کی جو آواز آیا کرتی وہ آدو بھائی ہی کی ہوتی۔ استاد چونک پڑتے اور حیران رہ جاتے۔ آدو بھائی کو کبھی کسی نے غصہ کرتے، غیر شریفانہ کام کرتے یا جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔

اسکول میں داخل ہوتے ہی پہلے امتحان میں اول آیا اس لئے اصول کے مطابق مجھے ہی کلاس کا سب سے اچھا طالب علم سمجھا گیا اور آدو بھائی سب سے خراب مگر نہ جانے کیسے ہم دونوں میں ایک تعلق قائم ہو گیا۔ آدو بھائی نے پہلے ہی دن سے مجھے ایسا اپنا خاص رفیق بنا لیا۔ جیسے کہ مجھ پر ان کا بہت زمانے کا حق تھا۔

آدو بھائی کا خیال تھا کہ وہ شاعر اور مقرر ہیں۔ اسکول کی ہفتہ وار محفل میں وہ تقریر بھی کرتے اور اپنی نظمیں بھی سناتے۔ ان کی نظموں پر سب لوگ ہنستے۔ اس ہنسی پر آدو بھائی کم حوصلہ بھی نہ ہوتے۔ بلکہ وہ اسے داد سخن سمجھتے۔ اس سے ان کا حوصلہ دوگنا بڑھ جاتا۔

اور سب معاملات میں آدو بھائی عقلمند ہی معلوم ہوتے۔ لیکن اس ایک معاملے میں ان کی کم عقلی پر مجھے دکھ ہوتا۔ ان کی کم عقلی کا طلبہ اور اساتذہ سبھی مذاق اڑاتے مگر وہ اسے سمجھ نہ پاتے۔ یہ دیکھ کر میرا دل آدو بھائی کا جانب دار ہوجاتا۔

اسی طرح چار سال بیت گئے۔ میں نے میٹرک کے لئے ٹسٹ کا امتحان دیا۔ آدو بھائی اپنے معمول کے مطابق اب بھی ساتویں درجے ہی میں تھے۔

(۲)

ماہ دسمبر.

سب درجوں کے امتحانات ہوئے اور انکے نتائج سنا دیئے گئے . کامیاب ہونے والوں کی تعداد اس بار بھی پچھلے دفعہ کی طرح ہر مضمون میں کامیاب ہونے والوں کے مقابلے میں دوگنی سے زیادہ تھی .

مگر آدو بھائی ان سب فیصلوں سے بالاتر تھے . اس لئے میں ان کی باتیں تقریباً بھول ہی گیا تھا . ٹسٹ کا امتحان دینے کے بعد میں ٹیٹور یل کلاس کر رہا تھا . طلبہ بے کار اسکول کی حدود میں ہم سے ملتے جلتے تھے . کامیاب طلبہ تو اپنا بارونق چہرہ لئے اپنی فوقیت جتانے کے لئے اور ناکامیاب تدابیر اور سفارشوں کے ذریعہ خصوصی مراعات کی امیدواری میں مشغول تھے .

ایسے میں آدو بھائی نے ایک دن مجھے تنہائی میں پا کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور رونے لگے . میں چونک پڑا . آدو بھائی کو ہم سب ہی مربی سمجھتے تھے . اسی لئے میں نے انہیں ہاتھوں کے زور سے اٹھا کر جواب میں خود ان کی قدمبوسی کی اور کہا ــ کیا ہوا آدو بھائی ؟ آپ نے ایسا کیوں کیا ؟

آدو بھائی نے میرے منہ کی طرف دیکھا ان کو اس قدر بے کل میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا . ان کے چہرہ پر بالکل بے چارگی برس رہی تھی .

میں نے ان کے کاندھوں کو زور سے ہلا کر کہا ــ کہئے ، کیا ہوا ہے ؟

آدو بھائی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــ پرموشن .

میں نے حیرانی سے پوچھا ــ پروموشن ، کیسا پروموشن ، کیا آپ نے پروموشن پایا ھے ؟

ــ نہیں ۔ مگر میں پروموشن چاھتا ھوں ۔

ــ اوہ ، آپ پروموشن لینا چاھتے ھیں ؟ یہ تو سبھی چاھتے ھیں ۔

آدو بھائی کسی مجرم کی طرح خائف اور لرزاں تھے ۔ سوچ بچار کے بعد گھما پھرا کر انھوں نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ اتنے دنوں تک انھوں نے پروموشن کی نہ تو کوشش کی اور نہ خواھش۔ وہ اسے قطعی نا پسند کرتے تھے کہ آنکو کھینچ تان کر آگے بڑھا دیا جائے ۔ لیکن ایک خاص وجہ سے اب کی بار انھیں پروموشن حاصل کرنا ھی پڑے گا۔ حالانکہ ھم دونوں اسوقت تنہا تھے پھر بھی انھوں نے میرے کان کے پاس منھ لا کر وہ سبب بتایا ۔ سبب یہ تھا کہ آدو بھائی کے لڑکے نے خود اس سال ساتویں درجے میں پروموشن پایا تھا ۔ اپنے لڑکے پر آنکو رشک یا حسد نہ تھا اور لڑکے کے ساتھ ایک درجے میں پڑھنے میں بھی انھیں کوئی اعتراض نہ تھا ــ لیکن آدو بھائی کی بیوی کو اس پر سخت اعتراض تھا ۔ اب دو ھی صورتیں تھیں یا تو آدو بھائی پروموشن پائیں یا پڑھائی کو خیرباد کہیں ۔ اگر لکھنا پڑھنا چھوڑ دیں تو آدو بھائی اور کس کام کے لئے زندہ رھیں گے ؟

میں نے آدو بھائی کی مصیبت کی اھمیت کو سمجھ لیا۔ ان کی درخواست پر میں ممتحن صاحبان کی خدمت میں سفارش کے لئے جانے پر راضی ھوگیا۔

پہلے میں نے فارسی کے معلم کے پاس جانا مناسب سمجھا ۔ کیونکہ انھوں نے تنہا مجھے ایک سو نمبر میں ایک سو پانچ

نمبر دئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب حیران ہوکر ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ لڑکے نے ہر سوال کا صحیح جواب لکھا تھا اس لئے اس نے پورا نمبر پایا ہے اس پورے نمبر پانے کی خوشی میں بطور انعام میں نے اسے پانچ نمبر اور بھی بخش دئے ہیں۔ بڑی بحث کے بعد بھی ہیڈ ماسٹر صاحب مولوی صاحب کو ان کی بے قاعدگی پر نہ قائل کر سکے۔

مولوی صاحب آدو بھائی کا نام سنتے ہی جل اٹھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایسا بدتمیز اور خدا کا نافرمان بندہ آج تک نہیں دیکھا۔ آخر میری سفارش پر انہوں نے ٹین کے بکس سے بڑی جستجو کے بعد آدو بھائی کی کاپی نکالی اور میرے سامنے پھینک کر کہا ــ دیکھو۔

میں نے دیکھا ــ آدو بھائی نے صرف تین نمبر پائے تھے۔ پھر بھی میں بے ہمت نہ ہوا۔ میں نے انہیں مجبور کیا کہ کم سے کم پاس نمبر دے دیں۔

اب تو بڑی دیر ہوگئی ہے۔ نمبر ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے چکے ہیں۔ غور و خوص بھی ہوچکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہر دلیل کا میں نے معقول جواب دیا۔ آخر انہوں نے کہا کہ تم کس کے لئے ایسی غلط سفارش کر رہے ہو ذرا کاپی کھول کر تو دیکھو۔

میں نے مولوی صاحب کو خوش کرنے کے لئے خواہش نہ ہونے اور ضرورت نہ سمجھنے کے باوجود کاپی کھول کر دیکھی۔ یہ فارسی کے پرچے کا جواب ضرور تھا مگر کہیں بھی ایک حرف اس پر فارسی کا لکھا ہوا نہ تھا۔ اس کے بدلے ٹھیٹھ بنگلا حروف میں کچھ ہوا تھا۔ میں حیرانی کے ساتھ اسے پڑھنے لگا ــ اس بنگالی میں فارسی زبان کو باہر سے لانا اور لڑکوں پر اس کا بوجھ ڈال دینا کتنی

بڑی جہالت، کیسی ناانصافی اور کتنا بڑا ظلم ہے. اس پر آدو بھائی نے ایک عمدہ مقالہ یا تھیسس لکھ ماری تھی .

میں نے جب پڑھ کر ختم کیا اور مولوی صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی تو انھوں نے فتحیابی کے انداز سے فرمایا ــ تم نے دیکھا اس بد تمیز کا کام ! میں نے تو بس اسے اپنی نیکی کی بنا پر تین نمبر دئے ہیں . دوسرا کوئی ہوتا تو اس کے اخراج (رسٹی کیشن) ہی کے لئے سفارش کرتا .

جو بھی ہو بالاخر مولوی صاحب میری سفارش رد نہ کر سکے اور کاپی پر تین کے ساتھ اور تین بڑھا کر انھوں نے اسے ۳۳ کر دیا . میں بڑی خوشی کے ساتھ حساب کے ماسٹر کے گھر کی طرف دوڑا .

وہاں دیکھا کہ آدو بھائی کی کاپی پر لال پنسل سے کرۂ ارض جیسا ایک بڑا کمرہ بنا ہوا ہے . معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے حاضری کا مقصد ظاہر کیا. حساب کے ماسٹر صاحب ہنستے ہنستے لوٹ گئے . انھوں نے آدو بھائی کی کاپی نکالی اور ہنستے ہوئے اس کا ایک خاص حصہ پڑھ کر سنایا . اس میں آدو بھائی نے لکھا تھا کہ پرچہ سوال چننے والوں نے اچھے اچھے سوالات کو چھوڑ کر چند فضول اور غیر ضروری سوالات کئے ہیں. اس لئے اور سوال چنندہ کی غلطیاں ظاہر کرنے کے لئے آدو بھائی نے خود ہی چند عمدہ سوالات قائم کر کے اس کے صحیح جوابات تحریر کئے تھے اسی طرح مقدمات قائم کر کے آدو بھائی نے جتنے سوالات کے جواب دئے تھے ممتحن نے پرچۂ سوال اور جوابات کو ملا کر مجھے دکھایا . حقیقت میں سوال کا جواب سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اس لئے نمبر کیسے مل سکتے تھے .

پرچہ سوالات کے ساتھ جوابات کا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو مگر آدو بھائی نے جو سوالات لکھے تھے ان کے جوابات اگر ٹھیک ہوں تو کامیاب ہونے کے لئے میں نے ممتحن سے پاس مارکس کی درخواست کی تھی لیکن استاد نے یہ بھی دکھادیا کہ ان سوالات کے جوابات بھی درست نہ تھے۔ وہ کسی طرح نمبر دینے پر راضی نہ ہوئے البتہ انہوں نے یہ اقرار کیا کہ دوسرے مضامین کے معلم اگر آدو بھائی کو کامیابی کے نمبر دیں گے تو وہ بھی اس کے پروموشن کے لئے سفارش کریں گے۔

بہت ہی مغموم اور شکستہ دل لے کر میں دوسرے معلمین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہر جگہ حالت تقریباً یکساں ہی تھی۔ جغرافیہ کی کاپی پر انہوں نے لکھا تھا کہ زمین کا گول ہونا اور سورج کے چاروں طرف گھومنا بالکل افیونیوں کی گپ ہے جس کو وہ کسی طرح بھی مان نہیں سکتے۔ اسی طرح تاریخ کی کاپی پر انہوں نے لکھا تھا کہ کون سا راجہ کس راجہ کا بیٹا تھا اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی کے جواب میں انہوں نے نواب سراج الدولہ اور لارڈ کلائیو کی تصویر پاس پاس بنانے کوشش کی تھی البتہ اگر نیچے نام نہ لکھا ہوتا تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی تصویر سراج الدولہ کی تھی اور کون سی کلائیو کی۔

میں ناامید ہو کر ہرسٹل واپس آیا۔ آدو بھائی پرشوق انداز سے میرے واپسی کے انتظار میں میری راہ دیکھ رہے تھے۔

میں نے واپسی جب پر مایوسی اور نا کامیابی کی خبر سنائی تو ان کا چہرہ بڑا ہی غمناک ہوگیا۔

—تو بھائی میرا اب کیا بنے گا؟ یہ کہہ کر وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔

بیٹھ گئے

کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے لئے میرا دل بیقرار ہوگیا۔ میں نے کہا کہ اچھا آدو بھائی میں ہیڈ ماسٹر کے پاس جاتا ہوں۔

آدو بھائی نے کچھ دیر میری طرف دیکھا پھر کہا ــ تم نے میرے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے بہت ہی شکر گزار ہوں۔ ہیڈ ماسٹر کے پاس تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس جانا ہوا تو میں خود جاؤں گا۔ ہیڈ ماسٹر سے میں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں مانگا ہے امید ہے کہ میری یہ درخواست وہ رد نہ کریں گے۔

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلے گئے۔

میں نے ایک نظر تیز تیز قدموں سے جانے والے آدو بھائی کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور پھر اپنے کاموں میں لگ گیا۔

(۳)

اس روز بڑے دنوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ صرف حاضری کے بعد اسکول میں تعطیل کا اعلان ہوگیا۔

میں نے باہر آکر دیکھا کہ بلندی پر ایک اونچا اسٹول رکھ کر آدو بھائی اس پر کھڑے ہیں اور اپنے ہاتھ اور پیروں کو حرکت دے کر تقریر کر رہے ہیں طلبہ ہجوم بنا کر ان کی تقریر سن رہے ہیں اور بیچ بیچ میں تالیاں بھی بجا رہے ہیں۔

میں بھی اس بھیڑ میں گھس گیا۔

آدو بھائی کہہ رہے تھے:ــ ہاں، پروموشن کے لئے میں نے منہ کھول کر کبھی نہیں کہا مگر کیا اسی سبب سے مجھے پروموشن

نہ دینا ان سب کے لئے مناسب ہوا ہے ۔ منھ کھول کر نہ کہنے سے میں نے اتنے دنوں تک ان کی عقلوں کا امتحان لیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان میں کچھ بھی دانائی ہے یا نہیں ۔ میں نے اس کی جانچ کی۔ میں نے دیکھ لیا کہ انصاف کا ایک شمہ بھی ان لوگوں میں نہیں ہے ۔ ان کے سینے دلوں سے خالی اور احساسات سے عاری ہیں۔ ایک شخص جو آنکھیں بند کئے محض ان کے انصاف اور ان کی توجہ پر اپنی زندگی چھوڑے بیٹھا ہے اس کے لئے اگر ان کے دلوں میں کچھ بھی احساس ہوتا تو کیا اتنے دنوں میں کبھی بیدار نہ ہوتا ؟

آدو بھائی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں ۔ انھوں نے اپنے بائیں ہاتھ سے آنکھیں پوچھیں اور پھر کہنا شروع کیا — میں نے ن لوگوں سے کون سی بڑی چیز مانگی تھی۔ بس صرف ایک پروموشن۔ اگر یہ دے دیتے تو ان کا کون سا بڑا نقصان ہوجاتا؟ یہ نہ سوچئے گا کہ میں ان لوگوں سے غصہ ہو گیا ہوں۔ میں نے غصہ نہیں کیا۔ میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ جن لوگوں کی عقل اور انصاف پر ہزاروں آدمیوں نے اپنے بچوں کی زندگیاں چھوڑ رکھی ہیں اور خود مطمئین ہوکر بیٹھے ہیں ان میں عقل کی کسقدر کمی ہے اور ان کی جانوں میں کتنی وسعت کا فقدان ہے ۔

ایک ذرا دم لیکر آدو بھائی نے پھر شروع کیا — میں نے بہت زمانے تک اسکول میں پڑھا ہے۔ میں نے ایک دن بھی ایک پیسہ فیس میں کمی نہیں کی۔ ہر سال نئی نئی کتابوں اور کاپیوں کے خریدنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا — ذرا غور تو کیجئے میں نے کتنے روپئے پیسے خرچ کئے ہیں ۔ اگر میں پوروموشن کے لئے اسی قدر نالائق تھا تو آپ ہی غور کیجئے کہ اتنے دنوں میں کسی

استاد نے مجھے یہ بات کیوں نہ بتائی، انھوں نے کیوں نہ کہا تمھارے پروموشن کی کوئی امید نہیں آدو میاں! تمھاری فیس ہم لوگ نہیں لیں گے۔ لیکن فیس دینے کے وقت کسی نے بھی منع نہ کیا۔ کتابیں خریدتے وقت کسی نے بھی مشورہ نہ دیا۔ صرف پروموشن کے وقت ان کے سارے ضابطے اور قاعدے میری راہ میں رکاوٹ بن گئے؟ اچھا اگر میں ساتویں جماعت میں پاس نہ ہوسکا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں آٹھویں جماعت میں بھی کامیاب نہ ہو سکوں گا؟ یہ بات انھیں کس نے بتائی! بہتیرے لڑکوں نے میٹرک اور آئی اے بس کسی طرح پاس کر لیا اور بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ میں جا کر فرسٹ ہو گئے۔ ایسی بہت ساری مثالیں میں دکھا سکتا ہوں۔ بس کسی منحوس قسمت ہی کی بنا پر میں ساتویں جماعت میں رک کر رہ گیا ہوں۔ ایک بار اگر کسی طرح اس کلاس سے پار ہوجاتا تو پھر میں بڑی آسانی سے اوپر کے درجے پاس کر جاتا۔ استاد صاحبان کو یہ سمجھنا چاہئے تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے آٹھویں جماعت میں پروموشن نہ دے کر میری زندگی کا ایک سال ان لوگوں نے خراب کر دیا۔

آدو بھائی کا گلا بھر آیا۔ انھوں نے ذرا رک کر دھوتی کے کھونٹ میں اپنی ناک اور منھ پونچھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ سامعین میں سے کئی کے گالوں پر آنسو بہ رہے تھے۔

گلا صاف کر کے آدو بھائی نے پھر شروع کیا۔ میں نے کبھی یہ سب باتیں نہیں کہا اور آج بھی نہ کہتا۔ لیکن اس لئے کہہ دیا کہ میرے بڑے لڑکے نے اس سال ساتویں جماعت میں پروموشن پایا ہے۔ وہ بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ چونکہ اس اسکول کے ماسٹروں پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے اس لئے میں نے اسے دوسرے اسکول میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ صحیح وقت پر میں اگر یہ احتیاط

نہ برتتا تو آج مجھے کس رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا اس کا آپ لوگ خود ہی فیصلہ کیجئے۔

آدو بھائی کے سارے جسم میں جیسے کانٹے چبھ گئے۔ ان کی آواز تیز ہوگئی اور انہوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا — ہاں، میں سچائی کو کامیابی سے ہمکنار کر کے رہوں گا۔ میں ایک نہ ایک دن آٹھویں جماعت میں۔۔۔۔

اسی وقت اسکول کے دربان نے آکر جلسہ درہم برہم کردیا لڑکے شور و غل کرتے ہوئے چلے گئے۔ میں بھی آدو بھائی کی نگاہوں سے بچتا ہوا کھسک گیا۔

پھر جیسا ہوا کرتا ہے دنیا کے سمندر میں کون کدھر بہہ گیا کسی کو پتہ نہ چلا۔

(۴)

میں بے۔ اے۔ کا امتحان دینے والا ہوں اس لئے بڑی محنت سے پڑھ رہا ہوں۔ یکایک سرخ لفافے میں مجھے ایک خط ملا۔ میں نے اس خیال سے اسے کھولا کہ غالباً کسی کی شادی کا پیام مسرت ہوگا۔ خوش رنگ حرفوں میں چھپا ہوا خط تھا۔ اس خط کے کاتب تھے آدو بھائی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں نے سانویں جماعت سے آٹھویں جماعت میں ترقی پائی ہے اس لئے احباب کے لئے نان و نمک کا بندوبست کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ تاریخ بہت پہلے ہی گذر چکی تھی۔ چونکہ خط گھر سے ہوتا ہوا آیا تھا اس لئے اس کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ مطبوعہ خط کے ساتھ ایک ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھی تھا۔ آدو بھائی کے لڑکے نے لکھا تھا کہ والد سخت علیل ہیں۔ ان کی آخری خواہش یہ ہے کہ وہ آپ سے ملاقات کر لیں۔

میں نے لکھنا پڑھنا چھوڑا اور فوراً آدو بھائی کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوا ۔ میں نے چار سال تک ان کی کوئی خبر نہ لی تھی اس لئے شرم و ندامت سے پانی پانی ہوا جارہا تھا ۔

لڑکے نے رو کر کہا ــ بابا کا انتقال ہوچکا ہے ۔ پروموشن کے لئے اب کی بار دن رات انہوں نے اس قدر محنت شروع کی تھی کہ وہ صاحب فراش ہوگئے مگر پھر بھی لکھنا پڑھنا نہ چھوڑا ۔ ہم سب کو ان کی زندگی کا خوف پیدا ہو گیا۔ محلے کے سارے لوگ مل کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئے اور انہیں پروموشن دینے کی کچھ اس طرح سفارش کی کہ انہوں نے ابا کو پروموشن کا یقین دلادیا۔ ابا نے بیماری کی حالت ہی میں پالکی پر جاکر اور لیٹے لیٹے امتحان دیا ۔ وعدے کے مطابق انہیں پروموشن مل گیا ۔

اب انہوں نے حکم دیا کہ پروموشن کی خوشی منانے کے لئے ایک تقریب منعقد کی جائے مدعوین کی فہرست بھی انہوں نے خود ہی تیار کی ۔ لیکن اس تقریب میں شرکت کے لئے جو لوگ آئے "وہ جنازے کی نماز پڑھ کر گھر واپس گئے "۔

لڑکا مجھے قبرستان لے گیا ۔ میں نے دیکھا کہ آدو بھائی کی قبر پر سنگ مرمر کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہے جس پر کندہ ہے ــ

Here sleeps Adoo Mian who was promoted from class VII to class VIII

لڑکے نے کہا کہ ابا کی آخری وصیت کے مطابق ہی یہ سب کچھ کیا گیا ہے ۔

محبوب العالم

۱۸۹۸ء میں ضلع چاٹگام کے موضع فتح آباد میں محبوب العالم کی ولادت ہوئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں شرکت کی۔ دوران جنگ میں میسو پوٹیما یا عراق میں انہوں نے تقریباً ایک سال صرف کیا۔ میدان جنگ کے تجربات نے انہیں مابعد کی زندگی کی ادبی تصنیفات میں بہت مدد دی۔ لڑائی سے واپسی کے بعد انہوں نے حکومت بنگال میں سب رجسٹرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور طویل ملازمت کے بعد ۱۹۵۳ء میں انہوں نے انسپکٹر آف رجسٹریشن کے عہدے سے پنشن لی۔

محبوب العالم نے مضامین نویسی ظریفانہ مضامین اور مختصر افسانوں کی تصنیف میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی تصنیفات میں ''پلٹن جینبیر شریتی'' (فوجی زندگی کی یاد) ، جومنیر زبان بندی ، تعزیہ ، پنچوانو اور الاپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر کتاب مشہور ادبی تصنیف کی حیثیت سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آب و ہوا

میں کمل گھرامی کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس کا چہرہ بشاشت سے خالی ہے۔ بس اس کا بکر بکر منہ چلتا ہی رہتا ہے۔ میں نے کتنی بار سزائیں دیں ــ مگر وہ ہے ہی بڑا مطیع مزاج کا۔ ادھر میں نے آواز دی اور وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ مگر اس کی عجب عادت ہے۔ کبھی کبھی وہ نادانستہ طور پر بھی اپنی بکر بکر جاری رکھتا ہے۔ کبھی ہاتھوں کے اوزاروں ہی کو مخاطب کر کے بولنا شروع کر دیتا ہے۔ اور کبھی میرے چھوٹے بچے کی جانب دیکھ کر بکر بکر منہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا رفیق کار نبین اسے ڈپٹتا ہے تب چونک کر چپ ہو رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے دماغی خلل ہے مگر پتہ نہیں کب سے یہ خلل اسے عارض ہوا۔

بکر بکر باتیں کرتے کرتے کمل کا دھیان بٹ جاتا ہے اور وہ کام بند کر دیتا ہے اور اس طرح میرے کام کا نقصان ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کمل مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ناہم جب میں مستقبل پر غور کرتا ہوں تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ میں غالباً کمل کو اپنی زندگی سے کبھی جدا نہ کر سکوں گا۔ ممکن ہے کہ اس کا وفادارانہ افتاد مزاج مجھے ایسا سمجھنے پر مجبور کرتا ہو یا ہو سکتا ہے کہ اور کوئی سبب ہو۔

کمل جس دن سب سے پہلے کام کرنے آیا اس روز گھوڑے جیسی لمبی ناک کے سوا اور کچھ بھی اس کے چہرے پر دکھائی

نہ دیتا تھا . پھر اس کا طبعی بکر بکر نظر آیا اور اسی نے اس کی جانب سے میرے مزاج کو برہم رکھا .

دوسری طرف پہلی نظر میں یہ پتہ چلا کہ نبین بہت کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے . وہ چپ چاپ کام میں لگا رہتا ہے . تل برابر دھوکا دینا نہیں جانتا . میں اس سے خوش نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے .

کمل اور نبین کام کرتے ہیں اور میں سامنے بیٹھ کر انتظام دیکھتا ہوں . ہم میں بس کام ہی کی وجہ سے تعلق ہے . خاموش بیٹھے رہنے پر بھی نبین میں اور مجھ میں ایک سمجھا بوجھا سا تعلق ہے . میں ہر وقت کتنے کاموں کی تکمیل کا متوقع رہتا ہوں اسے نبین دل ہی دل میں سمجھ جاتا ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی کم ہونے نہیں دیتا . وہ جتنا کام بھی کرتا ہے بڑے جتن سے کرتا ہے. مگر کمل کو اس کی بالکل پرواہ نہیں بس اپنا منہ بکر بکر چلانے میں ہی اس کی زندگی ہے . جب مجبوراً اسے خاموش رہنا پڑتا ہے اس وقت اس کا چہرا اس حد تک سنجیدہ بن جاتا ہے کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آنے لگتی ہے .

کمل شکایتوں کا مجموعہ ہے . مشکلات کی شکایتیں، بانس کے کچرے ہونے کی شکایت ، گھر پر چھپر نہ رکھنے کی شکایت ، بیوی کے جسم پر کپڑا نہ ہونے کی شکایت اسی طرح ممکن اور نا ممکن باتوں کی سیکڑوں شکایتیں تو تھیں ہی اس پر سے اب چھوٹے میاں یعنی نئے بچے کی وجہ سے شکایتیں اور بڑھ گئیں . کمل تو پہلے ہی ناکارہ تھا اس پر سے ان چھوٹے میاں نے تو اور بھی اس کی نا کارگی میں اضافہ کرنے کے لئے کمر باندھ لی .

کمل بندھن باندھ کر جب فاضل بیت کاٹنے کے لئے چھری

اٹھانا چاہتا تو دیکھتا وہ پاس نہیں ہے بلکہ کچھ فاصلے پر چھوٹے میاں اسے ہاتھوں میں لئے بیکار زمین کھودنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ ادھر کمل نے چیلم میں تمبا کو کو سجایا تو دیا سلائی اپنی جگہ پر موجود نہیں۔ تلاش کرنے پر وہ ملتی تالاب کے کنارے بھیگی ہوئی اور اس کی کانٹیاں ندارد ہوتیں۔ بعض بعض پانی پر تیرتی ہوتیں۔ اب ان کانٹیوں کو جمع کر کے دھوپ میں سکھانے کے لئے کمل کا ایک گھنٹہ وقت ضائع ہو جاتا ہے شام کو جب کمل گھر لوٹنا چاہتا تو دیکھتا کہ جسم کا کرتا چھوڑ کر باقی کپڑوں کو چھوٹے میاں کیچڑ میں لت پت سارے صحن میں گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ کرتے میں مٹی کا ایک ڈھیلا باندھ رکھا ہے۔ اب بیچارا کمل ڈھیلا کھول کر کپڑے کو جھاڑ لیتا۔ چھوٹے میاں اندر بھاگ جاتے اور کمل اس میلے کپڑے کو تحفہ یا انعام کی صورت میں کندھے پر رکھ کر گھر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا روانہ ہوجاتا۔

کمل اور چھوٹے میاں میں اور اس سے زیادہ تعلق قائم نہ ہو سکا۔ نہ تو کمل نے اسے کبھی گود میں اٹھایا اور نہ اس نے اپنی توتلی زبان سے کچھ باتیں کر کے کملی کا جی بہلایا۔ ممکن ہے یہ میری سخت گیر نگاہوں کی وجہ سے ہو۔ کمل کو چھوٹے میاں کی شرارتوں سے بچانے کے لئے میں نے ان کی چھڑی، چلم اور اس کے سامان اور کپڑوں کے رکھنے کے لئے محفوظ جگہیں ٹھیک کر دیں مگر اس سے کام نہ بنا۔ ادھر کمل سے غلطیوں میں اضافہ ہونے لگا اور دوسری طرف چھوٹے میاں سے بھول چوک میں کمی بھی بڑھنے لگی۔

میں نئی تدبیروں پر غور کر رہا تھا کہ ایک دن یہ بات سمجھ میں آئی کہ ان ہنگاموں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں نے

محسوس کیا کہ خاموشی ہی خاموشی میں ان دونوں نے ایک طرح کا سمجھوتہ کرلیا ہے۔ چھوٹے میاں کی شرارتیں کمل کو صرف محبوب ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ان کا منتظر رہنے لگا تھا۔ اس انتظار میں اس کا جو وقت گذرتا اس میں وہ حسب معمول بکربکر بند رکھتا اور حسب معمول کام میں مشغول رہتا۔ گویا یہ سمجھی بوجھی اسکیم کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ چھوٹے میاں جب چھری لیجانے تو کمل اس کی تلاش نہ کر کے دوسرے کام شروع کردیتا اسی طرح کمل کا کام جب اختتام تک پہنچنے پر ہوتا تو چھوٹے میاں اس کا کرتا گھسیٹنا بند کر کے اسے مناسب جگہ پر رکھ دیتے۔ کمل خندہ روی کے ساتھ چھوٹے میاں کو دیکھتا اور وہ بھی ہنستا ہوا اندر بھاگ جاتا۔

میں کچھ دنوں تک تو یہ بھول ہی گیا کہ نبین بھی کام کرتا ہے۔ جب گھر کے اس حصے کی تعمیر شروع ہوئی جس میں چھوٹے میاں رہتے تھے تو کمل کی ہمت اور تیزی قابل قدر حد تک بڑھ گئی۔ اس نے ایسے ایسے بے نقص نقشے بنائے کہ میں حیران رہ گیا۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ ایسا افلاس زدہ اور ناکارہ انسان بھی ایسے ایسے خوبصورت نقش و نگار کا تصور کر سکتا ہے۔ حوصلہ افزائی کے لئے اور کام میں دلبستگی پیدا کرنے کے لئے یہ چند روز چھوٹے میاں بھی دل کھول کر اس کے ساتھ لگے رہے۔ اب تو کمل کے ساتھ ہمارا تعلق ناقابل شکست ہو گیا۔ ان چند دنوں میں کمل نے جو کام کیا میرے دل میں نقش ہو گیا۔ اسی طرح نبین نے جو کام کیا وہ بالکل بے مقصد معلوم ہوا۔

میں نے ایک دن پوچھا۔ کمل! تمہارے کتنے لڑکے ہیں!

کمل نے نظروں سے ضیاء پاشی کرتے ہوئے جواب دیا۔

ایک لڑکا .

پوچھا ــ کیا عمر ہو گی ؟

اس نے حساب کئے بغیر جواب دیا ــ آٹھ برس ، تین ماہ اور تیئس دن .

میں نے سوچا ــ باپ ہے نا ، اسی لئے بیٹے کی عمر کا سال ، مہینہ اور دن تک یاد رکھتا ہے ــ ایک بیٹا ہے نا اسی لئے .

اس کے بعد برسات کے خوف سے چند دنوں تک کام کی اس قدر ہما ہمی رہی کہ چھوٹے میاں کا خیال ہی نہ آ سکا . ایک بڑے سپہ سالار کی طرح نبین اکیلا ہی کئی سو بن کر کام کرنے لگا . کوئی بات چیت نہ ہو سکی. مگر یہ بات صاف ظاہر ہونے لگی کہ گھر اگر بھیگ گیا تو ذمہ داری نبین پر ہوگی. نبین نے بھی اپنی سستی دور کر کے پورے زور شور سے حکم احکام جاری کرنے شروع کر دئے . یہ بات بھی سمجھ میں نہ آسکی کہ مالک میں تھا اور مجھ پر حکومت چلانے کا کسی کو اختیار نہ تھا. میں اور کمل دونوں ہی بڑی فرمانبرداری کے جذبے سے اس کے احکام کی تعمیل کرنے گئے وہ جیسے ہمارا سردار تھا اور ہم اس کے ماتحت . ہم یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ کمل کی بکر بکر بھی جاری تھی یا نہیں .

بالاخر کام ختم تک آ پہنچا . میں پہلے کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھ کر کاموں کی دیکھ بھال کرنے لگا .

جس دن کام بالکل ختم ہو گیا اس روز ایسا معلوم ہوا کہ نبین خوشی سے پاگل ہوا جارہا تھا . نجات کی خوشی ، فرصت کی مسرت اور پابندیوں سے چھٹکارے کی فرصت اس کے انگ انگ سے نمایاں تھی . لیکن کمل جیسے کھویا کھویا سا .

اس نے بکر بکر نہ کر کے جان و دل سے کام کیا پھر بھی نبین

نے اس کی بہت ساری غلطیاں نکال باہر کیں. اس روز نبین نے روز کی طرح اسے برا بھلا کچھ نہ کہا بلکہ دو ایک ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا . کمل لیکن ہر بار اپنے لاجواب ہونے اور غلط کام کرنے پر شرمندہ نظر آتا رہا .

بعد والا دن وہ تھا جب ان کی مزدوری بے باق کر کے رخصت کرنا تھا . صبح کو روز کی طرح میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی اور پھر گھر کی طرف لوٹا. میں نے دور سے دیکھا کہ دہلیز پر کمل اور چھوٹے میاں آمنے سامنے کھڑے ہیں. چھوٹے میاں ابھی نیند سے اٹھے ہی تھے اس لئے ان کے چہرے پر نیند کا خمار باقی تھا . میں نے دیکھا کہ کمل نے ایک مرتبہ چپ چاپ چاروں طرف دیکھا اور پھر کسی کو دیکھتے ہوئے نہ پا کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف بڑھا دئیے چھوٹے میاں نے بھی ہاتھ بڑھا دئے اور اس کی گود میں چلے گئے . تھوڑی دیر تک کمل نے انہیں سینے سے لگائے رکھا اور پھر نیچے اتار دیا . لڑکا متوقع نہ تھا کہ اس قدر جلد کمل اسے گود سے جدا کر دے گا پھر کمل نے بڑی محبت سے اپنی دھوتی کی کھونٹ سے ایک پکا ہوا بیل نکال کر چھوٹے میاں کو دیا جسے لے کر وہ خوشی خوشی گھر میں بھاگے غالباً کمل کو یہی توقع تھی کیونکہ وہ بھی ہنس رہا تھا . مگر نہ جانے کون سی دلی بیکلی نے پھر اسے غمگین کر دیا اور وہ آہستہ آہستہ وہیں بیٹھ گیا .

میں کمل کی مزدوری دیتے وقت بڑی سوچ میں پڑ گیا . جیسے بھی ہو مگر اس نیم مجہول انسان کو ملازم کی طرح تنخواہ دینے میں شرم محسوس ہوئی .

نبین بعد میں آیا. میں نے اس کی مزدوری بے باق کر کے پوچھا

ـــ تم نے کمل کے لڑکے کو دیکھا ہے!

نبین نے نفی میں سر ہلا کر کہا ـــ نہیں تو اس کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے .

میں نے متعجب ہو کر کہا ـــ کیسے ؟ اس نے تو کہا ہے کہ اس کا ایک لڑکا ہے جس کی عمر تقریباً آٹھ سال کی ہے .

نبین نے مسکرا کر جواب دیا ـــ یہ اس کی عادت ہے . لڑکا نہ جانے کب کا مر چکا ہے مگر وہ آج بھی زندہ لوگوں کی طرح اس عمر کا حساب کر کے اسے یاد رکھتا ہے .

میں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا ـــ تعجب ہے . اپنی آنکھوں کے سامنے لڑکے کو مرتے دیکھ کے بھی وہ یقین نہیں کرتا کہ اب وہ بچہ زندہ نہیں ہے ؟

نبین نے آہستگی سے کہا ـــ اس نے مرتے خود نہیں دیکھا . اس وقت وہ رنگون میں تھا . لڑکے کا جس دن انتقال ہوا اس کے دوسرے ہی بازار کے دن کمل کا بھیجا ہوا پارسل آ کے پہنچا. لڑکے کے لئے جوتا ، کتابیں اور بہت سارے کھلونے تھے . اسے اس کا بڑا شوق تھا کہ لڑکے کو پروان چڑھائے گا . پھر جب وہ رنگون سے واپس آیا تو یہ اس کا یہ متعاد بکر بکر شروع ہو گیا . ہر چیز سے نفرت ، ہر بات کے خلاف شکایت . اسے کوئی کام پر لگانا نہیں چاہتا . میں کسی نہ کسی طرح اس سے کام نکال لیتا ہوں .

میں چپ چاپ اندازہ کرنے لگا کہ نہ جانے کتنی بڑی ایک شکایت سینے میں دبائے وہ ہر چیز کے خلاف شکایت کرتا زندگی گذار رہا ہے .

نبین چلا گیا مگر آدھے راستے سے نہ جانے کیا سوچ کر واپس آ گیا . کچھ دیر وہ منتظر رہ کے بولا ـــ بابو جی ، میری ایک

درخواست ہے ۔ کیا آپ ششانک بابو سے کہہ کے میرا چوکیداری ٹیکس معاف کرا دیں گے ؟ بچے کچے تو ہوئے ہی نہیں ان چند بوڑھی ہڈیوں کا اگر چوکیدار نے پہرا نہ دیا تو کیا بگڑے گا ۔

میں اس کے انداز گفتگو اور گلے کی آواز پر چونک پڑا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ نبین کی آواز نہ تھی ۔ جیسے کسی تھکے ہارے انسان کی روح اس کے جسم کے اندر سے بول رہی تھی ۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص کتنا بڑا ہے ۔ اس کے دل کا دکھ درد جیسے کسی دوسرے کے دکھ درد میں سمو کر باہر ہو رہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس کی عظمت کو کمل ہی سمجھ سکتا ہے ۔ جبھی تو اس کی جھڑکیوں کو بھی وہ برداشت کر لیتا ہے ۔

دو مہینہ بعد ایک بڑی مصیبت آئی ۔ بخار کی وجہ سے لڑکا مدھوش ہو کر بے سر و پا باتیں کر رہا ہے ۔ ڈاکٹر باری باری سے چوبیس گھنٹے اس کے بستر کے پاس اس کی دیکھ بھال میں وقت گذار رہے ہیں ۔ لڑکا بس جھگڑا ہی کر رہا ہے ۔ اپنے بڑے بھائی یوسف کے ساتھ ــ بھائی میرا بیل ۔ میرا بیل ۔

شام کے قریب بخار کچھ کم ہوا مگر ڈاکٹر بدلی کے چہرے پر ایک شدید مصیبت کا سایہ ناچ رہا تھا ۔ میری طبیعت پر اتنا اثر تھا کہ میں سکون کی تلاش میں راستے پر چل پڑا ۔

بے خیالی میں نادانستہ طور پر چلتے چلتے میں کب باراز تک پہنچ گیا مجھے کچھ پتہ نہ لگا ۔ جب میں نے رتھ تلا میں بہت لوگوں کا ہجوم دیکھا تو مجھے ہوش آیا ۔ وہاں گانا اور کیرتن ہو رہا تھا ۔ میں نے غور سے دیکھا تو کمل باجا بجا رہا تھا ۔ اس کی دونوں آنکھوں سے ساون بھادوں جاری تھا پتہ نہیں وہ بجا رہا تھا کہ باجا از خود رفتہ ہو کر خود ہی بج رہا ہے ۔ ہری رام ، ہری

رام ، هری ، هری ، رام ، رام کہتا جا رہا ہے اور بے خودی میں چلا رہا ہے نبین ـــ آنکھوں کے آنسو سے اس کا سینہ تک بھیگ گیا ہے. حاضرین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی آنکھیں تر نہ ہوں

میں بے خودی میں ایک طرف بیٹھ گیا . دیکھتے دیکھتے ایسا محسوس ہوا کہ موجودہ لوگوں میں سے کسی کے دل میں بھی احساس باقی نہیں ہے . اسی سنگیرتن کے بیچ میں جیسے نبین کے نامولود بچے، کمل کا آٹھ سالہ بچہ، تندرست چھوٹے میاں ، کمل کا بھیجا ہوا پارسل ، سبھی دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر خوشی سے ناچ رہے ہیں. گویا سارے گم شدہ لوگ اسی جلسے میں براجمان ہیں.

محی الدین

منشی گنج ضلع ڈھاکہ کے موضع کھریا کھال پاڑا میں محی الدین جنوری ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے ۔ بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گئے ۔ خوش قسمتی سے کم عمری ہی میں انہیں کلکتہ جانا نصیب ہوا ۔ غربت کی وجہ سے اسکول اور کالج کی تعلیم تو ممکن نہ ہو سکی مگر اپنی کوشش سے انہوں نے پرائیوٹ طریقے پر انگریزی اور بنگلا کی متعدد تعلیم حاصل کی ۔ زندگی کے مختلف احوال سے یہ باخبر ہیں ۔ ان کی تصنیفات میں ان تجربات کی عکاسی نمایاں ہے ۔ ان کی تحریر میں قوت اظہار خیال بھی قابل ذکر ہے ۔ بے شمار نظمیں ناول ، مضامین اور افسانے انہوں نے لکھے اور شائع کئے ہیں ۔ ان میں سے منظوم کتاب ''پنیرگان ، جنون شادھرن ابنگ غریبر پانچالا '' ناول میں '' فوتن شورجو ، آلور پیپاشا ، در بھکو اور شلپر شپنو ، اور افسانوں کی کتاب میں نراد شیر جاتری وغیرہ قابل ذکر ہیں. انہوں نے ۱۹۶۲ء میں صدر کا انعام حاصل کیا ہے ۔

ڈاکٹر مرفیو

ایک ہی شکل و صورت کے دو جڑواں بھائی کہ ایک کو دیکھنے سے دوسرے کا گمان ہو. ایسا معلوم ہو کہ ایک ہی آدمی دو قسم کی پوشاک پہنے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمارے ہی سامنے چلتا پھرتا ہے .

مگر ایک طرح کے چہرے والے جن دو صاحبان کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ جڑواں بھائی نہیں ہیں . بلکہ وہ ایک سماج یا ایک قوم کے آدمی بھی نہیں ہیں .

باقر میاں کا بچپن نالقعہ کی کسی ایک گلی میں کٹا وہ بچپن میں اینگلو بنگالی بچوں کے ساتھ سارا دن گولیاں کھیلتے، لٹو گھمانے اور پتنگ اڑاتے . انھوں نے انگریزی بول چال کچھ اس طرح سیکھ لی تھی کہ وہ ان کی اپنی زبان معلوم ہوتی . پھر بچپن ہی سے وہ انگریزی پوشاک بھی پہنتے تھے اس لئے زبان اور لباس سے وہ بالکل ہی انگریز معلوم ہوتے تھے .

باقر میاں کا بالکل جوڑی دار جس سے ان کا تبادلہ بھی کیا جا سکتا تھا ایک اینگلو بنگالی لڑکا مرفیو تھا جس نے دولت‌مند باپ کے وظیفے پر غیر ملکی تعلیم حاصل کی تھی اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد وہ اپنے باپ کے چھاپے خانے کا مالک بن بیٹھا تھا .

ان کی بیالیس سال کی عمر تھی جب کلکتہ میں دونوں کی

ملاقات ہوئی .

واقعہ بہت ہی معمولی تھا .

باقر میاں ایک دن نوکری کی تلاش میں ڈاکٹر مرنیو کے یہاں جا پہنچے .

ڈاکٹر مرنیو اس وقت کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہوکر ڈرائنگ روم کے سامنے اسٹینڈ پر لٹکے ہوئے آئینہ کے بالمقابل کھڑے ہو کر اپنی سج دھج اور صورت ایک بار دیکھ لیناچاہتے تھے . وہ خود پسند بہت تھے . بیالیس سال کی عمر اور چہرا بھرا بھرا .

مگر یک بیک یہ کیا جناتی کار و بار ! آئینے میں بالکل انھی کا ہمزاد موجود تھا جسے دیکھ کر ڈاکٹر مرینو چونک پڑے.

اسی لمحہ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا . ہو بہو انھی کے جیسا ایک آدمی خاموش ان کے پیچھے کھڑا ہوا تھا . آنے والے نے مود دبانہ طور پر سلام کر کے عرض کیا ــ میں نے سنا ہے کہ آپ غریبوں کے مائی باپ ہیں . اگر آپ مجھے کوئی نوکری دے کے میری پرورش کریں تو میں ہمیشہ کے لئے ..."

مرینو نے کہا ــ نوکری ؟ اچھا کون سی نوکری کرو گے ؟ پھر کچھ دیر تک باقر میاں کو دیکھنے کے بعد انھوں نے کہا ــ میرے پریس میں اسٹورکیپر کی ایک جگہ خالی ہے. کام کرسکوگے ؟

اس نے کہا ــ اگر مہربانی کر کے . . .

مرنیو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ــ کیا نام ہے ؟

ــ باقرمیاں .

ــ دنیا میں تمھارا اور کون کون ہے ؟

ــ سر، پانچ آدمی کھانے والے ہیں. پھر ایسا محسوس ہوا

جیسے ان پانچ کھانے والوں کے بوجھ نے اس کی گردن جھکا دی ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے بال بچوں کا کوئی جھمیلا انھوں نے پالا ہی نہ تھا۔

باقر میاں سے مرنیو کو بڑی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ پھر یہ بھی تھا کہ باقر میاں ہوبہو اسی کے ہمزاد بھی تھے۔ اس امر نے انھیں بہت متعجب بھی کیا اور ان سے مزید ہمدردی کا سبب بھی بن گیا۔ مرنیو خود ایک فلسفی تھا اس لئے تلاش و تفحص کا جذبہ اس کے دل میں از خرد پیدا ہو گیا۔

اب پھر میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس وقت باقر میاں مرنیو کے پریس کو خیرباد کہہ کر پھر کلکتہ کے راستوں پر تلاش معاش میں پھر رہے تھے۔

راہ پیمائی کا بھوت جس شخص پر سوار ہوجاتا ہے اسے پیر توڑ کر اور نچلا بیٹھ کر نہ تو کوئی کام پسند آتا اور نا ہی گھر یا ملازمت کا بندھن ہی اسے بٹھا سکتا۔

ہمارے باقر میاں پیدائشی رہ نورد تھے۔ بے خیالی میں وہ کلکتے کے راستوں میں پھرتے اور پیچھے سے کسی موٹر کے ہارن کی آواز سن کر وہ فٹ پاتھ کے کنارے تک کھسک جاتے۔ کتنی بار وہ لائٹ پوسٹ سے لگ کر کھڑے ہیں کہ ایک موٹر سن سن کرتا بالکل پاس سے گذر گیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے موت کا فرشتہ بس دو فٹ کے فاصلے سے گذر گیا ہے۔

— بس اک ذرا دیر تھی ورنہ پراٹھا ہی ہوجاتا۔ موٹرخانہ چاہے بیٹرے ہی کا ہو مگر ایک موٹر مجھے بھی ضرور چاہئے۔ یہ تھا باقر میاں کا خیالی پلاؤ۔

موڑ کے لیٹر بکس پر لال، نیلے اور دوسرے رنگ کے چھپے

ہوئے سنیما کے اشتہارات لگے ہوئے ہیں ۔ ٹیلیفون کے کھمبوں پر ٹین کی پلیٹ پر لکھے ہوئے اشتہارات "سیونگ سرٹیفیکیٹ" کے لگے ہوئے ہیں دوسری جانب ایک لق و دق چار منزلہ عمارت ہے۔

باقر میاں دل ہی دل میں کہتے ہیں ــ اگر وہ مکان میرا ہوتا ! اچھا اگر ہوتا تو میں کیا کرتا ؟ میں بھی ڈاکٹر مرنیو کی طرح آرام کی زندگی گذارتا ۔

پھر موٹر کا ہارن بجتا ہے اور باقر میاں ایک کنارے ہٹ کے کھڑے ہوجاتے ہیں ــ وہ موٹر کا ہارن بجا کے کہتے ہیں ۔ کھسک جا ، کھسک جا ، راستہ چھوڑدو ، تیرا آقا آرہا ہے ۔

باقر میاں دل ہی دل میں کہتے ہیں اور پھر اپنے ظریفانہ کلمات پر خود ہی ہنستے بھی ہیں ۔ وہ اور بھی دل ہی دل میں کہتے ہیں ــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی شان و شوکت اور نفیس پوشاک دکھا کے غریب دیکھنے والوں کی آنکھوں پر مہریں لگا دینا چاہتے ہیں ۔ وہ ہارن بجا بجا کے کہتے ہیں ــ دیکھو دیکھو ، ہم کتنے خوب صورت ہیں ، ہم کتنے آرام اور سکھ میں ہیں ۔ تم لوگوں سے ہم کتنے اونچے ہیں اور تم کتنے چھوٹے اور کس قدر نا چیز ہو ۔

باقر میاں کو بہت رشک پیدا ہوتا ہے ۔ بار بار ان کے دل میں ڈاکٹر مرنیو کی باتیں یاد آتی ۔ وہ دونوں ہم عمر ہیں ، دونوں ہی انسان ہیں لیکن علم ، سمجھ اور دولت میں کتنا عظیم فرق رکھتے ہیں ۔

باقر میاں نے ڈاکٹر مرنیو کے مطبع میں لگاتار سات برس تک اسٹور کیپر کی حیثیت سے کام کیا تھا ۔ ڈاکٹر مرنیو کا مطبع بہت بڑا تھا ۔ ان کی علمیت ، ان کی دولت اور سب سے بڑھ کر ان کی

خوب صورت بھانجی روزا نے مل کر باقر میاں کو بری طرح حسد کی آگ میں جلا دیا تھا .

باقر میاں جس قدر حسد کی آگ میں جلتے اسی قدر شراب زیادہ پیتے . آخر میں نوبت یہاں تک آ گئی کہ مہینہ ختم ہونے پر جب چالیس روپئے تنخواہ کے جیب میں لئے وہ پریس سے باہر نکلتے اور حساب کر کے دیکھتے تو لوگوں کے قرض کی ادائیگی کے لئے اسی روپیوں کی ضرورت ہوتی . پھر شراب کی لت تو بڑھتی ہی جا رہی تھی .

ان حالات میں ایک دن ڈاکٹر مرینوں کی میز سے زنجیر کے ساتھ سونے کی گھڑی چوری ہو گئی . اس کے کئی دن کے بعد ہی پریس سے پیتل کی ایک درجن اسٹیکیں چوری ہو گئیں. اس کے بعد باقر میاں کے گھر کی جب تلاشی ہوئی تو پیتل کے کئی درجن رول نئے ٹائپ اور سیسے کے ٹکڑے برامد ہوئے .

ڈاکٹر مرنیو نے ہنس کر کہا ــ میں خیال کرتا ہوں کہ اگلے مہینے تمہاری تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار کر دوں گا . اور یہ چالیس روپیہ ایک ماہ کی تنخواہ بطور انعام کے لے لو . کیا میری سونے کی گھڑی بیچ چکے ہو ؟ وہ گھڑی میرے باپ نے مجھے ایک سالگرہ کی تقریب میں بطور یادگار دی تھی .

باقر میاں نے کچھ نہ کہا. ڈاکٹر مرینو کے ہاتھ سے چالیس روپیہ لے کر جو پریس سے نکلے تو پھر وہاں واپس نہ گئے. ڈاکٹر مرنیو نے اسے پولس کے حوالے نہیں کیا بلکہ معاف کر کے اور رحمدلی دکھا کے اسے اپنی عظمت کا نمونہ دکھایا تھا ــ باقرمیاں یہ بات برداشت نہ کر سکے بلکہ اسے ڈاکٹر مرنیو سے اور زیادہ حسد پیدا ہو گیا .

پھر آج کسی سنیما میں ملازمت ، کل کارنیوال کی منیجری وغیرہ کرتے کرتے آخر کار بے کار ہو کر اچکوں کی جماعت کے ایک رکن بن بیٹھے تھے .

ایک ہی جست میں بڑا آدمی بننے کے شوق میں باقر میاں نے بڑے بڑے گل کھلائے تھے . ایک مرتبہ جعلی نوٹ سازی اور دو بار ٹھگ ماری کرنے کی پاداش میں وہ کئی سال تک جیلوں کی ہوا بھی کھا آئے تھے .

جیل سے آخری بار رہا ہونے کے بعد وہ سیدھے سیندور یاٹپی کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے . ان کے چہرے پر ایک مشت لمبی داڑھی تھی اور جسم پر بوسیدہ قمیص اور پتلون. انہوں نے ظاہر کیا ــ میں عیسائی ہوں اور مسلمان ہونا چاہتا ہوں. اسلام کی ہمہ گیری اور احکام اسلام کے محاسن نے مجھے اس مذہب کا والہ و شیدا بنا دیا ہے . آپ براہ کرم میری راہ نمائی فرمائیں .

اس طرح اسلام کی راہنمائی حاصل کر کے مسلمان باقر میاں مسلمان باقر میاں اب پھر سے مسلمان ہوئے . ان کی قسمت اچھی تھی. پہلے ہی دن نماز جمعہ کے بعد ایک گز چوڑا رومال بچھا کر اسلام کے متعلق اپنے متعقدات اور پھر اس کے نمونے انہوں نے اس خوبی سے پیش کئے نیز غیر مسلموں کو اس طرح مغلظات سنائیں کہ سامعین کے منہ سے بے اختیار " مرحبا مرحبا " نکل گئی . اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان کے رومال پر ان گنت چونیوں، اٹھنیوں، روپے اور دو پے کی بارش ہونے لگی . بعد میں حساب کر کے دیکھا گیا تو دو سو اکتیس روپیہ تین آنے نو پائی چندہ جمع ہوا تھا .

باقر میاں رومال میں روپے اور پیسے سمیٹ کر کے سیدھے چورنگی کے ایک رستوران میں جا بیٹھے .

مسلمان اب اور چندے نہیں دیتے . اتفاقاً دو ایک بڑے آدمی کے دروازے پر جاکر انھیں ملازمت کی امید بندھی . مگر نوکری کر کے تو وہ ڈاکٹر مرنیو نہیں بن سکتے تھے ڈاکٹر مرنیو بنے کے لئے کم سے کم لاکھروپیہ تو چاھئے. رھی علمیت، لیاقت اور صلاحیت اس کے لئے تو کوئی فکر ھی نہیں کسی قابل تنخواہ دار سکریٹری کے ذریعہ یہ کام چل سکتا ھے .

ذوق تو بہت کچھ بیدار ھوتا ھے مگر ادھر جیب جو خالی ھے . باقر میاں خود ھی بہت کچھ کہتے اور رہ نوروی کرتے رھتے ھیں .

ایک دن کسی ایک پارک کے ایک گوشے میں پام درخت کے سائے میں ایک سبز رنگی ھوئی بینچ پر بیٹھ کے باقر میاں نے جیب سے سوکھی ھوئی پاؤ روٹی کا ایک ٹکڑا اور کاغذ میں لپٹی ھوئی پنیر باھر نکالی پھر چاروں طرف دیکھکے اطمینان کیا کہ اسے کوئی دیکھتا ھے یا نہیں—نہیں، مجھے کوئی نہیں دیکھ رھا ھے— یہ کہہ کے باقر میاں نے خشک روٹی کا ایک لقمہ اور پنیر کا ایک ٹکڑا منھ میں دبایا .

تھوڑی ھی دیر کے بعد بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا وھاں آ پہنچا جس کا چہرہ سیاھی مائل تھا . لڑکے کے جسم پر اس کے چہرے سے بھی سیاہ تر ایک باریک کپڑے کا کرتا تھا . ٹانگوں میں لنگی تھی - باقر میاں جس بینچ پر بیٹھے ھوئے تھے اس کی دوسری جانب وہ بیٹھ گیا -

باقر میاں دوسری طرف منھ کر کے روٹی چبانے لگے -

لڑکے نے جیب سے ایک بھنا ھوا موٹا شکرقند نکالا اور اسے لقمہ لقمہ کر کے کھانے اور ھر طرف دیکھنے لگا -

اسی طرح کچھ وقت گذر گیا۔

دوسری طرف ایک گھنی جھاڑی کے پاس ایک بہت ناٹا مگر مریض نما انگریز سپاہی ایک بڑی لمبی اور موٹی لڑکی کے ساتھ محبت کی پینگ بڑھا رہا تھا۔

ادھر اس تیرہ سالہ بچہ کی نگاہ باقر میاں پر پڑی۔ ان پر ایک نظر ڈال کے وہ چپ چاپ سے بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھایا اور پھر کہا — سلام سر! آپ یہاں ہیں؟

باقر میاں اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہی رہے۔

لڑکے نے انہیں سر سے پاؤں تک اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد ہنس کر کہا — مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں سمجھا تھا کہ آپ ڈاکٹر مرینوں ہیں۔ آپ کا چہرہ تو بالکل ویسا ہی ہے۔

اس کی باتیں سن کر باقر میاں چونک پڑے۔ کیا واقعی وہ دیکھنے میں ڈاکٹر مرینو جیسے لگتے ہیں؟ اب کیا تھا ان کے دماغ میں ایک خیال انگڑائیاں لینے لگا۔ انہوں نے لڑکے سے پوچھا — تم ڈاکٹر مرینوں کو پہچانتے ہو؟

— کیو نہیں۔ میں تو ان کے یہاں بوائے کا کام کرتا ہوں۔

— خوب خوب، بہت خوب۔ یہ کہہ کے باقر میاں نے اسے دلدھی کے ساتھ قریب کھینچ کے بٹھایا۔

اس وقت دوسری جانب سنسان کنج کے پاس کوتاہ قد اور لاغر سپاہی ایک بینچ پر چڑھ کے بہت لمبی اور خوب موٹی عورت کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے منہ سے منہ ملائے کبوتر اور کبوتری کی طرح محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

باقر میاں نے اس لڑکے کو اچھی طرح مانوس بنانے کے بعد کہا — بیٹا، تم بڑے خوش نصیب معلوم ہوتے ہو؟ تھوڑے ہی

دنوں میں بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ اچھا لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں!

لڑکے نے ان کی جانب اپنا داہنا ہاتھ بڑھا دیا۔

باقر میاں نے بڑے غور کے ساتھ اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا اور پھر کہا — میں نے جو گمان کیا تھا وہ صحیح نکلا۔ پھر ایک نشان کی طرف اشارہ کر کے کہا — یہ نشان جس کے ہاتھ میں ہوگا وہ یقیناً بڑا آدمی بن کے رہے گا۔

لڑکے نے خوش ہو کے کہا — سچ؟

— میں سچ کہتا ہوں۔ تم بلا شبہ بڑے آدمی بنو گے۔ اچھا تمہارا نام؟

— خورشید۔

— خورشید؟ یہ کہہ کے باقر میاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کے زور زور سے رونے لگے۔

خورشید نے کہا — آخر کیا ہوا؟ آپ روتے کیوں ہو۔

باقر میاں نے روتے روتے کہا — بیٹا! ٹھیک تیرے ہی جیسا میرا ایک بھتیجا تھا۔ وہ ملیٹری ٹرک کے نیچے دب کے فوت ہو گیا۔ آج تمہیں دیکھ کے مجھے اس کی باتیں یاد آتی ہیں۔ یہ کہہ کے اس نے خورشید کے گلے میں باہیں ڈال کے رونا شروع کردیا۔

ایک دن رات کو ڈاکٹر مرینوں رات کا کھانا کھا کے اپنی آراستہ لائبریری میں بیٹھے — "مین اینڈ دی ارتھ" (آدمی اور زمین) نامی اپنی فلسفیانہ کتاب کے ایک باب میں کچھ لکھ رہے تھے مرنیو فلسفے میں ڈاکٹر تھے اور اندرون ملک کے علاوہ بیرون بھی ان کی شہرت تھی۔ لیکن اس شہرت اور نام آوری کے لئے

انھیں جس قدر دولت اور عمر صرف کرنی پڑی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہی ان کا تیس سالہ جدو جہد کا سرمایہ تھا۔

" آدمی اور زمین " کا وہ خاص باب لکھتے لکھتے ان کے ذھن میں آیا ــ زندگی کے ایک لمحے کی قیمت سارے جہان کی دولت سے زیادہ ہے . پھر بھی شہرت اور عظمت کے لئے انسان کیا نہیں کرتا . وہ اپنے استحکام کے لئے لمحات حیات کو قربان کر دیتا ہے .

آدھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی . مرنیو نے بڑی ناخوشگواری کے ساتھ اٹھ کر ٹیلیفون کا ریسیور کان سے لگا لیا .

ــ ھلیو ! مرنیو اسپیکنگ .

ــ ھلیو ایوننگ . میں پروفیسر ھدا بول رھا ھوں . میں آل انڈیا فلاسیفکل کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی طرف سے بول رھا ھوں ، کیا آپ کا خطبۂ استقبالیہ چھپ چکا ہے ؟

ــ ھاں .

ــ تو پھر کل ٹھیک تین بجے ھم لوگ ایک جلوس میں آپ کو لینے آرہے ھیں . ٹھیک ہے تو ؟

ــ ھاں ٹھیک ہے .

ــ اچھا تو پھر " گڈبائی " .

مرنیو فون رکھ کر اپنی جگہ آ کر بیٹھا بھی نہ تھا کہ فون کی گھنٹی بجی .

ــ ھلیو !

ــ میں آل انڈیا کرسچین کمیٹی کے دفتر سے بول رھا ھوں اگلی بائیس تاریخ کو بنگلور میں ھماری کانفرنس ھو رھی ہے . آپ کو صدر منتخب کیا گیا ہے .

کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں .

پھر جب مرنیو اپنی کرسی پر آ کر بیٹھنے لگا تو دروازے کے باہر سے ایک آواز آئی ــ سر میں داخل ہو سکتا ہوں ؟ مرنیو نے ناراضی پر قابو پاتے ہوئے کہا ــ آجاؤ .

پریس کا منیجر کمرے میں داخل ہوا . اس نے کہا ــ حکومت ہند کی طرف سے ایک ٹھیکہ موصول ہوا ہے. ڈھائی کروڑ نسخے مطلوب ہیں. بہت منفعت کی توقع ہے. خط و کتابت مکمل ہوچکی ہے . بس آپ کو ایک بار دھلی جا کر سکریٹری سے بالمشافہ تکملہ کر لینا ہو گا .

مرنیو نے ابروؤں کو جنبش دے کر پوچھا ــ کب جانا ہوگا؟

ــ پرسوں طوفان ایکسپرس سے .

ــ اچھا۔ یہ کہہ کر مرنیو نے اپنی بدمزاجی کو چھپانے کے لئے میز پر رکھے ہوئے مسودے کے اوراق الٹنے پلٹنے شروع کئے . منیجر نے کہا ایک بات اور بھی ہے .

ــ کہئے .

ــ پریس کے مزدوروں نے ہڑتال کی نوٹس دی ہے .

ــ کس سبب سے ؟ ڈاکٹر مرنیو کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی .

ــ پندرہ مطالبات ہیں . ان میں تنخواہ کا اضافہ ، گرانی کا بھتا ، رخصت کی سہولتیں وغیرہ . حساب کر کے دیکھا گیا ہے کہ اگر انہیں منظور کر لیا جائے تو منافع کی مجموعی رقم میں سے پانچ فیصدی چھوڑنا پڑے گا . میں حد درجہ ڈھائی فیصدی تک راضی ہوں .

مرنیو نے اختصار کے لئے کہا ــ جو مناسب سمجھئے کیجئے

منیجر نے اور بھی کچھ دیر تک مغز خوری کی اور پھر چلا گیا۔

پھر بھی خاتمہ نہیں ہوا۔ یکے بعد دیگرے اور بھی کئی آدمی آئے اور گئے۔ خیراتی انجمن کا سکریٹری، یونیورسٹی کا پروفیسر، مزدور تحریک کا لیڈر اور اینگلو انڈین کمیٹی کا وفد۔

اسی طرح روزانہ صبح سے رات گئے تک یکے بعد دیگرے بے شمار لوگ اور ان گنت کام آ کر ڈاکٹر مرنیو کے وقت کو پارہ پارہ کر کے ختم کر دیتے۔ ان سب مشاغل سے فارغ ہو کر جب مرنیو اپنی فلسفیانہ تحقیقات کے لئے بیٹھتا تو تمام دن کی تکان اسے ناکارہ بنا چکی ہوتی۔

پھر بھی مرنیو بڑی زبردستی سے لکھنے بیٹھتا۔

لیکن دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا کوئی پھر یہ کہتا سنائی دیتا ــ سر! میں آسکتا ہوں؟

ــ کون؟ مرنیو کی آواز سے اب درد کے علاوہ رنج بھی ظاہر تھا۔

ــ میں ہوں باورچی۔ یہ کہتے کہتے ہمارے باقر میاں کمرے میں آ پہنچے جو تقریباً ایک مہینے سے اپنے مفروضہ بھتیجے خورشید کی سفارش پر یہاں باورچی گیری کر رہے ہیں۔

مرنیو اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھتا رہا۔

باقر میاں نے آگے بڑھ کر بازار کی چیزوں کی ایک لمبی فہرست سامنے دی اور کہا ــ آج اکیس روپیہ پانچ آنہ چھ پائی خرچ ہوا ہے۔ سر، کل کے لئے حکم دیجئے۔

روزانہ کے گھریلو کاموں اور بازار وغیرہ کے متعلق اخراجات کی ذمہ داری مرنیو کی بھانجی روزا کے ذمہ تھی۔ ادھر ایک مہینے سے روزا بیماری سے اٹھ کر تبدیلی آب و ہوا کے لئے الموڑہ چلی

گئی ہے. اس لئے گھریلو جھمیلوں کا ناخوشگوار بوجھ بھی ڈاکٹر مرنیو ھی کے سر آپڑا ہے .

مرنیو مگر روز بروز چڑچڑا ھوتا جارھا ہے ــ کام ، کام ... بس کام . ان سب کاموں کے بندھن سے فارغ ھو کر نہ جانے کب وہ اپنا پورا وقت فلسفیانہ موشگافیوں کے لئے وقف کر سکے گا . شاید زندگی میں نجات نہ مل سکے گی . موت تو ھر روز قریب تر آتی جارھی ہے. ایسی کوئی رات یا دن نہیں گذرا جس دن وہ موت سے غافل ھو کر اطمینان اور بے فکری کی سانس لے سکا ھو . کبھی کبھی سنسان رات میں وہ جاگ کر اور موت کے تصور سے بے خواب ھوکر بستر پر اٹھ بیٹھا ہے . یہ شہرت ، یہ دولت ، آخر کس کام کی ؟ کس کے لئے ؟ اس کے دل میں ایک خوف زدہ انسان جیسی کپکپی پیدا ھو گئی . موجودہ زندگی کے مٹنے اور فنا ھونے کا خوف اس کے دل میں بارھا آیا کہ بس صبح ھوتے ھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راھبانہ زندگی اختیار کر لے گا . سب کو چھوڑ کے کہیں دور بھاگ جائے گا . لیکن صبح ھوتے ھی اسے پھر رنگا رنگ کاموں میں مشغول ھو کر دنیا اور سنسار کے بندھن میں قیدی بننا پڑتا ہے .

مرنیو یک بیک کرسی چھوڑ کر کھڑا ھو گیا . باقر میاں کی طرف دیکھ کر خاموش نہ جانے کیا سوچتا رھا پھر اس نے آھستہ آھستہ کہا ــ باقر ! سنو .

باقر میاں نے چونک کے کہا ــ سر ! آپ کیا فرمارھے ھیں میں باقر نہیں حضور کا باورچی ھوں .

مرنیو ھنسا . پھر کہا ــ ڈرو نہیں . میں نے تمھیں بہت پہلے ھی پہچان لیا تھا . تم میری آنکھوں میں دھول نہ ڈال

سکو گے. تم شاید یہ نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے . میں نے بہت دنوں تک مختلف جگہوں پر آدمی بھیج کر تمہیں تلاش کرایا تھا . . . . مگر تم خودھی آ کر مجھے مل گئے.

باقر میاں چپ چاپ سنتے رہے .

مرنیو نے کہا ــ کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے کہ میرے اور تمہارے چہرے میں ایک حیرتناک مماثلث ہے .

باقر میاں منہ کھولے دیکھتے ہی رہے .

مرنیو نے کہا ــ میری باتیں سنو . ادھر آؤ . دیکھو میں اپنا لباس اتار دیتا ہوں . میں اپنا گھر ، اپنی دولت اور اپنا سب کچھ تمہیں دے کر چلا جاتا ہوں . آج سے تم ڈاکٹر مرنیو کہے جاؤ گے اور میں ایک بے خانماں باقرمیاں . آؤ ادھر آؤ .

پھر خاموش رات میں مرنیو نے باقر میاں سے اپنی زندگی بدل لی اور نہ جانے کہاں گمنام ہو گیا. اب وہی نادان باقر میاں ڈاکٹر مرنیو بن گیا. اور اصلی ڈاکٹر مرنیو باقرمیاں بن کر روپوش ہو گیا .

اس واقعے کو سات سال گذر گئے . دنیا میں بڑے بڑے تغیرات آئے اور اسی تبدیلی کے چکر میں پھرتے پھرتے ڈاکٹر مرنیو ایک دن واپس آ گیا . اب میں وہی واقعہ بتاتا ہوں .

ایک اندھیری رات میں موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور ہوا کی سنسناہٹ کان کے پردے پھاڑ رہی تھی. گھر میں حسین روزا پیانو بجارہی تھی اور قریب ہی باقر میاں عرف ڈاکٹر مرنیو ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے خاموش نہ جانے کیا سوچ رہے تھے .

ان سات برسوں میں اس کے چہرے پر بھی بڑے تغیرات آچکے ہیں اس کے سر کا اگلا حصہ بالوں سے خالی ہوچکا ہے

ہے اور باقی بال سب پک چکے ہیں . رخسار کا گوشت لٹک پڑا ہے . اوپر سے بلڈ پریشر اور ضعف معدہ پیچھے لگا ہوا ہے .

یہ سات سال اس کے سینے پر بڑا وزنی چاک چلاتے ہوئے بیتے ہیں اور سینے کے انجر پنجر کو پیستے ہوئے چلے گئے ہیں .

نقلی مرنیو کو اصلی مرنیو کا کردار سات برس تک ادا کرنا پڑا ہے . بارہ سکریٹری رکھ کر اس نے فلسفہ میں بڑی مہارت حاصل کرلی ہے. بڑے جلسوں میں صدارت کر کے اس نے سکریٹری کے لکھے ہوئے خطبات پڑھے ہیں اور بڑی تحسین و آفرین پائی ہے منیجر اور ملازمین کی محنت سے اس نے اپنے پریس کو غیرمعمولی ترقی دی ہے . لیکن اس کے معاوضے میں اسے کیا ملا ہے .

برباد صحت اور نا مسرت بخش زندگی .

ادھر روزا کے پیانو پر آج کوئی سرھی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے.

ادھر (نقلی) مرنیو کیسی مردہ دلی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے .

ایسے وقت میں میلا ، پھٹا ، پرانا پینٹ اور بوسیدہ قمیص پہنے ایک شخص کمرے میں داخل ہوا .

روزا نے ایک چیخ کے ساتھ جست کر کے کہا ــ کون ؟ تم کون ہو ؟ یہاں سے دور ہو .

نقلی مرنیو نے صوفہ پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ــ یہاں کیا چاہتے ہو ؟ نکلو یہاں سے . بوائے ، بوائے .

آنے والے نے دھیمے لہجے میں کہا ــ آج چھ دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے . خدا کے لئے مجھے ایک ٹکڑا روٹی کا دو .

روزا نے انگلی کے اشارے سے دروازہ دکھا کر کہا ــ باہر نکلو . میں کہتی ہوں باہر جاؤ .

آنے والے نے بڑے غمناک اور شکستہ لہجے میں کہا ــ

روزا ، تو مجھے بھول گئی . میں ھوں تیرا ماموں ڈاکٹر مرنیو اور جو شخص تمھارے پاس مرنیو بن کر بیٹھا ھوا ھے . . . .

روزا چیخ کر بولی ــ چپ رھو . یہ پاگل خانہ نہیں ھے . جاؤ ، باھر نکل جاؤ .

ھمارے باقر میاں عرف ڈاکٹر مرنیو نے اب اپنی جگہ سے آھستہ آھستہ آگے بڑھ کر کہا ــ آہ ، روزا چپ رھو . تم نے نہیں پہچانا . یہ تو ھمارا وھی پرانا باقرمیاں ھے . وھی جو ھمارے پریس میں اسٹور کیپر تھا اور جس نے میری سونے کی گھڑی چوری کی تھی . افسوس بیچارہ کس بری حالت میں یہاں آیا ھے . پھر اس نے آنے والے سے کہا ــ سنو باقر میاں ! آج شاید تم نے شراب زیادہ پی لی ھے اسی لئے واھیات باتیں بکے جارھے ھو . اچھا چلو میں تمھیں نیچے تک پہنچا آؤں. یہ کہہ کر اس نے تقریباً کھینچتے ھوئے ڈاکٹر مرنیو کو کمرے سے باھر نکالا اور اپنے ساتھ نیچے لے گیا .

آنے والے نے کہا ــ باقر مجھ پر رحم کرو . سات سال تک راستے راستے مارا مارا پھرا ھوں . میں سمجھا تھا کہ مجھے نجات حاصل ھو گئی . مگر آہ نجات نہ مل سکی .

ــ ھاں ھاں ، میں سمجھ گیا . غربت ، افلاس اور ناخوری تمھیں یہاں واپس لائی ھے. تم نے سمجھا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بہادر ھو . مجھ سے بھی بڑے ھو .

آنے والا خاموش رھا .

باقر میاں نے کہا ــ اچھا ، ڈاکٹر مرنیو سنو . تم سے زندگی بدل کے مجھے بھی رھائی نصیب نہ ھو سکی. لو ، یہ اپنی پوشاک لو ، یہ لو تمھارے سب کپڑے . اپنا وہ گندہ اور بوسیدہ لباس

مجھے دیدو۔

نیچے زینے کے کنارے اندھیرے میں ان دونوں نے پھر پوشاک بدل لی۔ پھر بارش اور ہوا کے جھونکوں میں باقر میاں راستے پر چلتا ہوا غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر مرنیو سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا اوپر آ گیا اور کہا — روزا! رات بہت جا چکی۔ اب جاؤ سو رہو۔ ہاں دیکھو اگر کبھی باقرمیاں سے تمہاری ملاقات ہو تو اس سے کہنا کہ وہ ڈاکٹر مرنیو کو معاف کردے۔

ابو جعفر شمس الدین

ابوجعفر شمس الدین ۱۳۱۷ب کے پھاگن مہینے میں موضع دکھن بھاگ ضلع ڈھاکہ میں جنم لیا۔ ڈھاکہ مدرسہ اور ڈھاکہ کالج سے فراغت حاصل کر کے وہ ۱۹۳۰ء میں کلکتہ چلے گئے اور صحافت کو اپنا پیشہ بنالیا۔ انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل مثلاً دھلی کے انڈپنڈنٹ انڈیا، مطبع اخبارات اورینٹ پریس آف انڈیا ، روزآنہ آزاد، روزآنہ نبوجگ، پاکستان آبزرور ، اتحاد، ایسٹرن ہیرلڈون میں بحیثیت صحافی، معاون مدیر، مدیر اخبار کاتب اداارت اور خاص میر کی حیثیت سے کام انجام دئے ہیں۔

مختصرات نے، ناول، ڈرامے اور بنگلا و انگریزی کے مضامین نگار کی حیثیت سے وہ بہت زیادہ شہرت کے مالک ہیں۔ قبل تقسیم اور بعد تقسیم تک مشرقی پاکستان کے تمام درجہ اول کے اخبارات و رسائل میں ان کے افسانے، ڈرامے اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور ہورہے ہیں۔ ان سب کے انگریزی میں بھی تراجم ہوچکے ہیں۔ پری تکتو شامی، مکتی اور بھاول گڑر آپکھیان ان کے مصنفہ ناول، سرشٹو گلپو اور جبیں افسانوں کا مجموعہ اور شنگرھو اور پرتیھپی اور کنکال ان کے شائع شدہ ڈرامے شہرت پاچکے ہیں۔ انکی پہلی تحریر انگریزی کے ایک تنقید نگار کی حیثیت سے کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار اسٹار آف انڈیا میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ ''دوئی بون'' ماہوار محمدی کے ۱۳۳۹ب میں شائع ہوا تھا موجودہ وقت میں وہ بنگلا اکادمی کی خدمت کررہے ہیں۔

(لیڈر) نیتا

جس سیاسی جماعت کے ساتھ ہمارا تعلق تھا اس میں مقرر کا افلاس تھا اس لئے دوچار تقریریں کرتے ہی میں ایک چھوٹا موٹا لیڈر بن گیا میں اپنی تقریروں میں کیا کہتا یا کس موضوع پر گل افشانیاں کرتا وہ باتیں تو آج یاد نہیں مگر اتنی بات آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ تقریر کے خاتمے پر جب میں اسٹیج سے نیچے اترتا تو ہر جانب سے مردوں اور عورتوں کی تالیوں کی گونج میرے کانوں کے پردے چیرتی ہوئی اندر گھستی اور دل تک آبحیات گھولتی چلی جاتی میں اپنے آپ کو بڑا با اقتدار سمجھنے لگتا اور دل ہی دل میں پھول جاتا۔

مجھے افسوس ہوتا کہ ابتدئے عمر ہی میں میں نے اپنی ان صلاحیتوں سے کیوں کام نہ لیا۔ میں اس غلطی پر اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اپنی آنکھوں کی حیا کو خیر باد کہہ کے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر میں لگ کر اپنی زندگی کے بیش بہا لمحات کو ضائع نہ کیا ہوتا تو بھارت کے سرکردہ نیتاؤں کی فہرست میں میرا نام بھی نمایاں حروف میں بلا شبہ بہت دنوں پہلے ہی چھپ گیا ہوتا۔ خاص طور پر اگر میں کسی قدیم اور پائیدار سیاسی جماعت سے وابستہ ہوا ہوتا تو پھر کوئی بات

ھی نہ تھی ۔ اک ذرا خواھش پر وزیر یا سفیر بن جاتا ۔

میں غور کر کے دیکھتا تھا کہ ھمارے دوست دیو کی کی بہن تارا پھٹی پھٹی نگاھوں سے میری جانب دیکھتی ھی رہ جاتی ۔ ان پراشتیاق نگاھوں کی زبان ــ میں مقرر ھوں شاعر نہیں ، کیسے سمجھ سکتا ھوں ۔ تاھم اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ھوں کہ ان اشتیاق بھری نظروں کے مطالب بڑے ھی عمیق تھے ۔ ان میں استعجاب ، قدر و منزلت اور عقیدت مندی کے ساتھ کچھ محبت کے جذبات بھی ضرور میرے دل کو محسوس ھوا کرتے تھے ۔

پارٹی کے اجلاس میں جب میں تقریر کرتا تو مرد و عورت سبھی بہ اتفاق محو حیرت ھو کر خاموش میری تقریر سنتے ۔

زندگی میں کبھی مجھے کسی خاتون کی محبت نصیب نہ ھو سکی تھی اس سے جسم کو کون سا امرت حاصل ھوتا ھے اس کا تجربہ بھی مجھے نہیں تھا ۔ لیکن انسانی زندگی کے متعدد حالتوں میں مرد و عورت کے اتصال کا جو جذبہ دلوں میں موجزن ھوا کرتا ھے اس کے انتداز سے میں محروم نہ تھا ۔

میں اس کے نتیجے میں شریمتی تارا کی جانب جھک پڑا اس کے ساتھ معمولی باتیں بھی کرنے میں مجھے مزا ملتا اور اس سے اپنی محبت کی پیاس بجھاتا ۔ ھاں مگر وہ مجھ سے بڑی خاطر اور احترام کے ساتھ باتیں کرتی ۔ وہ صرف میٹرک پاس تھی اس لئے میرا خیال تھا کہ اسے میرے جیسے لیڈر سے بااحترام طریقہ پر ملنا اور باتیں کرنا چاھئے تھا ۔

نہ جانے کیسے مگر مجھے یہ محسوس ھونے لگا کہ تارا کے ساتھ میرا دلی لگاؤ بڑھتا جارھا ھے اور اسی احساس کے تحت میں دیوکی سے بیش از پیش ملنے جلنے لگا ۔

دیوکی ایک بڑا مشہور قومی کارکن تھا۔ اس وقت کے دہشت پسند انقلابی لوگوں کے ساتھ اس کا عملی طور پر تعلق تھا اور اس لئے سارے بنگال میں اسے شہرت حاصل تھی۔

میرے ساتھ جب اس کی ملاقات ہوئی اس وقت دہشت پسندانہ انقلابی تحریکوں اور اس قسم کی سیاست سے بد دل ہوچکا تھا۔ عوام کے تعاون، اعتماد اور خدمت خلق کے بغیر کسی قابل نمونہ مقام تک پہنچنا ممکن نہیں ہے یہ حقیقت اس نے تجربہ کر کے معلوم کی تھی۔

اس حقیقت کے احساس کے ساتھ ساتھ وہ پارٹی کے لئے عوام کا تعاون حاصل کرنے کی خاطر گاؤں گاؤں پھرتا تھا۔ ہر روز وہ گرد و غبار سے بھرے ہوئے راستوں اور کیچڑ سے لت پت پگڈنڈیوں پر پیدل چل کے میلوں راستہ طے کیا کرتا۔

سنہ ۵۰ ب کا قحط اب شروع ہو چکا تھا۔

اس وقت سیاسی باتیں، فاسسٹ طاقت وغیرہ کے خلاف عوام کو متحد ہو کر جنگ کرنے کی باتیں وہ ہنسی مذاق کی صورت میں سناتا پھرتا۔ دیوکی کو نہ آرام تھا اور نہ فرصت۔

دبلا پتلا جسم لئے وہ دیہاتی عوام کے سامنے سیاست کی باتیں کرتا پھرتا اور اسی بیچ میں ہاٹ اور بازار اور بندرگاہوں پر جلسے جلوس بھی کرتا پھرتا۔

ایسے ہی ایک جلسے میں اس نے مجھے دعوت دی۔ اس نے کہا۔ تارا بھی جائے گی۔ اس میں بھی سیاست کی جانب کافی میلان پایا جارہا ہے۔ وہ بھی غالباً تقریر کرے گی۔ بھائی تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔

یہ سن کر کہ تارا بھی جلسے میں شریک ہوگی میرا دل

باغ باغ ہوگیا . کچھ فاصلہ پر گاؤں میں جلسہ ہوگا اس لئے اس روز شہر واپسی نہ ہوسکے گی ، اور ایسے موقعہ پر تارا سے طویل اور دل خوش کن مذاکرات کا موقع مل سکے گا اس میں شک نہ رہا . اس لئے ایسے سنہرے موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی نادانی ہوگی .

میں نے اس کی دعوت سنتے ہی یہ سب کچھ سوچ کر منظور کر لی .

تاہم ذرا اک قیمت بڑھائے بغیر جھٹ منظوری بھی تو مناسب نہیں تھی اس لئے ہاں کرنے سے پہلے میں نے اک ذرا تکلف برتنا چاہا .

— اچھا بتاؤ وہ جگہ کس قدر دور ہے ؟

— بھئی ہے تو دور . بس میں جانا پڑے گا. تقریباً تیس میل کا فاصلہ ہوگا .

— اچھا تو رات کو رہنے کی کیا صورت ہوگی ؟ .

— اس کے لئے تمھیں سوچنا نہ پڑے گا . ایک خوش حال ماہی گیر کے مکان پر ٹھہرنے کا انتظام کر کے آیا ہوں .

— مجمع ہوگا تو ؟ ایسا تو نہیں کہ سو دو سو آدمیوں ہی کے سامنے گلا پھاڑنا پڑے .

— امید تو ہے کہ مجمع اچھا ہی ہوگا . ہاٹ بازار میں ڈھول بجا کر جلسے کا اچھی طرح اعلان کر دیا گیا ہے . یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ آٹے اور خوراک کی کمی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی جائیں گی . اس لئے یقین ہے کہ مجمع اچھا خاصہ ہوگا .

ایک تو چوبیس گھنٹے کے لئے تارا کی محبت کا یقین اور

پھر بڑے مجمع میں تقریر کی توقع نے میرے شوق کی آگ کو اچھی طرح ہوا دی۔ اس لئے میں نے کہا ــ جب اتنا اصرار کرتے ہو تو جانا ہی پڑے گا۔

ــ ہاں ہاں جانا ہی پڑے گا۔ یہ کہہ کے دیوکی نے اس روز کی مجھ سے رخصت مانگی۔

دوسری صبح کھانا پینا جلد ختم کر کے میں تقریباً گیارہ بجے گڑیاہاٹا روڈ کے موڑ پر جاموجود ہوا۔

وہاں پہنچ کے میں نے دیکھا کہ دیوکی کے داہنی طرف تارا بھی موجود تھی۔ سیدھے سادے لباس میں تارا بڑی دیدہ زیب معلوم ہورہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دیوکی کھل اٹھا اور بولا ــ آؤ، بھائی آؤ بس کی روانگی میں بس پانچ منٹ کی دیر ہے۔

میں کچھ نہ کہہ کے تارا کے داہنی جانب جا کھڑا ہوا۔ دل ہی دل میں سوچنے لگا ــ سماجی بندھنوں اور رکاوٹوں کی دیوار کو پھاندکر کیا تارا کو ہمیشہ کےلئے اپنا رفیق بناسکوں گا؟

کچھ دیر بعد ہی بس ہم لوگوں کو لے تیز رفتاری کے ساتھ بڑھنے لگی۔

* * * * * *

مغربی بنگال کا گنڈگرام بازار۔ جیسے اس کی صورت کمزور سی ویسی ہی اس کی حالت ناگفتہ بہ۔ محض چند شکستہ جھونپڑے، جیسے بدرونق بیوہ بڑھیا۔ کسی میں ٹین کے نیچے بانس کا بٹیرا تک نہ تھا۔ دوکان کی حیثیت سے بس ایک مودی کی دوکان اللہ اللہ خیر سلا۔

کھیتوں کی ٹیڑھی میڑھی مینڈیں راستے میں۔ بس اسٹیشن سے

تقریباً تین میل دور جب ہم وہاں پہنچے تو شام کے تین بج چکے تھے اور جلسے میں آمد شروع تھی۔

*　　*　　*　　*

میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا۔ ملکی اور غیر ملکی سیاست کے متعلق پوری طاقت سے بولتا جارہا ہوں۔ بیچ بیچ میں فاسسٹ حکومت پر کڑی تنقید اور اس کے مصائب بھی ظاہر کرتا جارہا ہوں۔ حکومت برطانیہ کے مظالم پر بھی زور بیان صرف کر رہا ہوں اور اس میں بھی شک نہیں کہ بیچ بیچ میں تالیوں کی گونج بھی کانوں میں پہنچ رہی ہے۔

شام ہوتی جارہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اک ذرا ذرا اندھیرا اجالے پر غالب آنے لگا تھا۔

ایسے وقت میں میری نظروں کے سامنے ایک عجیب و غریب منظر آ گیا۔ میں اسٹیج پر سے بہت دور تک کے مناظر پر نظر ڈال رہا تھا۔ مجھے نظر آیا کہ تقریباً نصف میل کے مسافت پر انسانوں کی ایک قطار میری طرف چلی آرہی ہے ذرا آگے بڑھنے پر صاف عورتوں کی قطار دکھائی دینے لگی۔ وہ سب اسی طرف رواں دواں تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ قافلہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ انسانی اعضا رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگے۔

گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور سیکڑوں جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس کمزور جھولتے ہوئے اعضا آگے کو جھکے ہوئے چلے آرہے تھے۔ ہوا سمت مخالف سے چل رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے ان کی برداشت سے باہر تھے اس لئے ان کا جسم زیادہ تر جھکا جارہا تھا۔ کسی کسی کا سر ایسا جھکا ہوا جیسے زمین

بوس ہوگیا ہے۔ مدتوں سے تیل سے ناآشنا بال گرد و غبار کی آمیزش سے جٹاؤں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ان کھلے ہوئے بالوں پر آنچل کے پردے نہ تھے۔ تیز ہوا ان جٹاؤں کو ٹوٹے ہوئے برتنوں کی طرح ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔ چیتھڑوں کے آنچل بھی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سیاہ تانبے جیسے رنگ والے جسموں میں ہڈیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پیٹ پیٹھ سے مل کر دفتی بنے ہوئے تھے۔ دودھ اور خون سے خالی پستان سوکھ کر سینے پر ایسے جھول رہے تھے جیسے پھٹے ہوئے لباس کے جھولتے ہوئے جیب۔ بعض بعض کے سینے، گود یا کاندھوں پر بچے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کے باوجود وہ قطاریں بڑھتی ہوئی آرہی تھیں۔ ایک جماعت والے جن کی کمریں جھکی ہوئی تھیں ٹیڑھے میڑھے ہوکر گرتے پڑتے چلے آرہے تھے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں میں کھا جانے والی بھوک بیدار نظر آرہی تھی۔ جیسے بیسا کھ کے مہینے کی طوفانی ہوا شمال کی جانب سے آندھی اور طوفان کی صورت ساری دنیا کو ہڑپ کر جانے کے لئے بڑھتی چلی آتی ہے، جیسے چھوٹے، بڑے، درمیانی سب ہی سیاہ، سخت سیاہ، توے جیسے سیاہ، سفیدی پر سیاہی ملے ہوئے شہاب ثاقب کی طرح بدیس کی دھوپ میں جلے ہوئے خوفناک حد تک سیاہ کالے ابر کے مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے، جیسے سارے سال کی بھوک مٹانے اور ساری دنیا کو ہڑپ کر جانے کے ارادے سے نکلے ہوں، وہ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

وہ سب عورتیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی لمبی لمبی باہیں جسم کے مستقل حصہ سے علیحدہ ہوکے محض چند رگوں کے ساتھ جھول رہی تھیں یا جیسے کسی بڑے

درخت کی کوئی شاخ کاٹ کر چھلکے کے ذریعے لٹکا دی گئی ہے۔ عجائب خانے میں جس طرح مردوں کی لاشیں اس طرح رکھی ہوتی ہیں کہ ان کی بانہیں لٹکتی معلوم ہوتی ہیں بس ویسے ہی ان کی باہیں بھی نیچے کو جھول رہی تھیں انگلیاں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے لمبی لمبی کانٹیاں۔ دونوں آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی دو خوفناک چنگاریوں کی طرح ایسی روشن تھیں جیسے کسی سانپ کی خون آلود آنکھیں چمکتی ہیں۔ گھڑیال کے دانتوں کی طرح ان کے سارے دانت جبڑوں تک سے باہر نکل آئے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یاجوج ماجوج کا قافلہ رواں دواں ہے جنہوں نے اپنی تیز دھار دار زبانوں سے پہاڑوں کو چاٹ کر کے ختم کر دیا ہے۔ مگر ان کی بھوک نہیں مٹی اور اب وہ کھلی دنیا میں اپنی بھوک مٹانے کے لئے نکل آئے ہیں۔ درخت، شاخیں، پتے، جانور، پرندے، انسان، مچھلی، دریا سمندر المختصر بحر و بر کی تمام مخلوقات کو کھا لینے کے بعد شاید ان کی بھوک مٹ سکے۔ بھوکے سمندر سے اٹھی ہوئی موجیں جس طرح سامنے کی سب چیزوں کو ہضم کرتی ہوئی بس بڑھتی ہی جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی راستے میں جو کچھ ملتا کھاتے، ہضم کرتے آگے بڑھتے جائیں گے۔ رحم ختم ہو جائے گا، محبت مٹ جائے گی، حسد فنا ہو جائے گا۔ مخاصمت نہ رہے گی۔ بھوک کی جلن میں بھسم ہو کر یہ دنیا کو بالکل معمولی طور پر ایک خونخوار وحشی جانور کی طرح ہضم کرتے آگے بڑھیں گے۔ دیوار کی چھپکلی جس طرح مکھیوں کو بے دردی کے ساتھ ہضم کر لیتی ہے اسی بے فکری کے ساتھ یہ بھی سب کچھ کھا لیں گے اور ڈکار تک نہ لیں گے۔ بھوکوں کی اس شدید جلتی ہوئی آگ کے سامنے تمہاری، ہماری کسی کی

خبر یت نہیں .

تقر یر کب خود بخود ختم ہوگئی تھی اسے میں نہیں بتا سکتا. بس اسٹیج پر کھڑا ایک ھی طرف دیکھے جا رہا تھا . جسم کے سارے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے . ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مقناطیسی طاقت نے مجھے اسٹیج پر باندھ رکھا تھا .

اژدھوں کی نظروں کے سامنے جیسے شکار طاقت رفتار کھوکر بے سدھ کھڑا رہ جاتا ھے اور پھر آھستہ آھستہ کھانے والے کے پیٹ کی طرف بڑھتا بڑھتا اس کے پیٹ میں داخل ہوجاتا ھے بالکل اسی طرح میں بھی اس تیزی سے بڑھنے والے اور سانپوں کی طرح اینڈے بینڈے چلنے والے قافلے کے سامنے بے دست و پا ہو کر اور اس کا شکار بن کر ھضم ہو جانے کا انتظار ھی کر رہا تھا .

وہ سب اور بھی قر یب آ گئے . آھستہ آھستہ وہ جلسہ گاہ کے بالکل پاس آپہنچے. ان میں سے بہتیری صرف ھڈیوں کا ڈھانچے اور بے گوشت بانہیں خود بخود ھماری جانب پھیل گئیں گو یا کہ ان بانہوں کے آگے جو کچھ آئے گا اسے وہ مٹھی بند کر کے نگل لینا چاھتے ھیں . ایسا معلوم ہوتا کہ بہت ساری چنگڑی مچھلیاں اپنے لمبے لمبے کانٹے والے ڈینوں سے اپنے شکار کو پکڑنا اور کھانا چاھتی ھیں . یقین ہو رہا تھا کہ بہت سارے ھڈیوں کے ڈھانچوں نے کسی جادو کے زور سے حرکت حاصل کرلی ھے اور انسانی مجمع کو نگل جانے کے لئے وہ آ موجود ہوئے ھیں .

یک بیک یہ ھڈیوں کے ڈھانچے اور کانٹوں جیسی بانہوں والے ایک ساتھ ھم آواز ہو کر چیخے ــ کھانا دو ! چاول دو ! دھان دو !. ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بانسوں کے جنگل میں طوفان

آ گیا ہو اور ان کی خوفناک کھڑکھڑاہٹ میں سے " خوراک خوراک " کی آوازیں بلند ہورہی ہوں .

ان خوفناک آوزاوں نے میرے اس طلسمی بندھن کو جو مقناطیسی تاثیر رکھتا تھا توڑ دیا میرے منھ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور میں جلسے کے اسٹیج سے کود کر نیچے آ گیا اور اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ ڈسٹرکٹ بورڈ کے لال کنکر بچھائے ہوئے راستے پر بے تحاشا دوڑنےلگا. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دوڑ میں کامیابی ہی پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے . پیچھے پھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی . بس کانوں میں یہی آوازیں آرہی تھیں ــ دھان دو ! چاول دو ! کھانا دو ! . یہ آوازیں میرے کانوں کے پردے کو پھاڑ کر دل پر ہتھوڑے برسانے لگیں .

میں اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ تیز تر بھاگنے لگا. اوروں کی باتیں سب بھول گیا. بس اپنی جان. اسے کیسے بچاؤں ۔ یہ ہی سوچتا تھا اور دوڑتا تھا . میں لیڈر ہوں ، میں مقرر ہوں ، مجھے یہ ضرور کھا جائیں گے . خوف کا یہ حال کہ گویا وہ ہڈیوں کے ڈھانچے میرے پیچھے مجھے پکڑنے کےلئے بھاگے چلے آرہے ہیں .

میں اکھڑی سانسوں سے اور بھی تیز بھاگتا رہا . میں لیڈر ہوں ۔ مجھے ابھی زندہ رہنا ہے ۔ میرا مستقبل ہے . اگر میں نے دیر کی تو ان ڈھانچوں کے ہاتھوں میری زندگی ختم ہو جائے گی اور میں چند لمحوں ہی میں مٹی میں مل کر مٹی بن جاؤں گا . بس آج کے بعد ہی میرے اچھے دن پھریں گے اس لئے آج مجھے ان ڈھانچوں

سے جہسے بھی ہو سکے بچنا ہے . ان کے حملوں سے جان بچانی ہے.
جان بچانی ہے . یہی اقرار ، یہی فکر اور یہی امید لئے میں
اکھڑی سانسوں سے بھاگتا رہا .

مگر بدنصیبی کہ آج تک اس بھاگ ڈور سے نجات
نہ مل سکی .

شوکت عثمان

مشرقی پاکستان کے افسانہ نگار ادیبوں میں شوکت عثمان ایک خاص انداز تحریر کے مالک ہیں . اپریل ۱۹۱۷ء میں ضلع ہوگل ، مغربی بنگال کے موضع سیل سنگھ پور میں ان کی ولادت ہوئی . بچپن پہلے مدرسہ اور پھر اسکول میں گذرا آخر کلکتہ یونیورسٹی سے انھوں نے ایم - اے - کی ڈگری حاصل کی . یہاں سے فراغت کے بعد ہی انہیں گورنمنٹ کالج میں پروفیسری مل گئی . فی الحال وہ ڈھاکہ کالج میں بنگلہ کے ممتاز پروفیسر ہیں .

افسانوں، ڈراموں اور ظریفانہ مضامین میں شوکت عثمان نے بڑی مہارت حاصل کی ہے. ان کے مضامین سب سے پہلے شیشو سوغات (تحفۂ اطفال) نامی ماہوار رسالے میں چھپتے رہے. ان کی پہلی تصنیف کا نام تھا ''سندر بن ایر باش'' اس کے ذریعہ انہیں بچوں کے متعلق افسانے لکھنے کی بڑی کامیاب صلاحیت کا سب سے پہلے علم ہوا . اس کے بعد ان کی کتاب کا فکرمنی تلم کی کتاب ایک ظریفانہ ڈرامے کی صورت میں شائع ہوئی . پھر '' کرتیوداش ایرھانشی (زر خرید غلام کی ہنسی) ، جنتی ، جنوآ . پا ... ناول اور افسانوں نے بڑی شہرت حاصل کی . انہیں بنگلہ اکادمی اور آدم جی ایوارڈ کے انعامات بھی مل چکے ہیں .

(دو آنکھیں) دوئی چوکھ

کسٹمز جہاز آیا ہے .

واقعی بحری پولس کا لانچ آرہا تھا . شب گشت میں ندی کے اندر سے اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ رفتہ رفتہ صاف تر سنائی دے رہی تھی .

ظاہر میاں نے شمپان کی بجھتی ہوئی آگ کو ذرا تیز کیا .

برسات کے آسمان پر بپھرے ہوئے بادل ۔ دوپہر بھر خوب بارش ہوتی رہی. پانی سے بھری ہوئی گھٹائیں افق پر چھاونی ڈالے پڑی ہیں . جلد آسمان صاف ہونے کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی

شمپان میں ہلکی ہوا کے جھونکے سے لالٹین ہل رہی ہے. بیٹھ روشنی کی جانب ہے اس لئے ظاہر میاں کا سایہ ایک مورت کی طرح دکھائی دیتا ہے. اگلے حصے پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا ہے جیسے محض سائے کی لکیر .

ظاہر میاں نے پھر کہا ــ کسٹم کا جہاز آرہا ہے .

ــ آنے دو . ہمارے شمپان میں کیا افیم کا خزانہ ہے ؟ ساتھ کریم نے جواب دیا .

ــ نہیں بھائی . خواہ مخواہ مشکل میں پھنسنے سے حاصل . اس دفعہ یاد نہیں پورے شمپان کو تحس نحس کر دیا تھا .

ــ خوف کی کیا بات ہے ؟ آنے دو .

ظاہر میاں ندی کے کنارے سے کئی سو فٹ کے فاصلے پر لنگر انداز تھے اور اس کا شمپان موجوں کے تھپیڑے کھا رہا تھا .

ــ میاں ، ذرا سنبھل کے بیٹھو . پانی میں جہاز . . .

ظاہر میاں بے خیال ہو کر بیٹھا ہوا تھا . پانی میں وہ یقیناً جانا نہیں چاہتا تھا . ساتھی نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں پایا .

ــ ظاہر میاں ذرا سنبھل کر بیٹھو نا !

ظاہر میاں اب کھسک کے شمپان کے بیچ میں آ بیٹھا .

تاریک دریا کے پانی پر لالٹین کی روشنی ہلکی شعاعیں ڈال رہی تھیں . اس نے اس جانب نظر گھمائی .

ظاہر میاں کے مزاج پر اثر پڑنا ہی تھا . وہ کئی دنوں سے گھر سے باہر تھا . آج اس نے واپسی کا دن متعین کیا تھا مگر اب بھی تاخیر ہو رہی تھی .

ــ بھئی اور کیا کہیں . ایک ہفتہ گذر گیا . گھر میں ایک دانہ چاول بھی چھوڑ کر نہیں آیا تھا .

ظاہر میاں کو گھر چھوڑے ایک ہفتہ گذر چکا ہے . وہ ایک دانہ چاول بھی گھر چھوڑ کر نہیں آیا تھا .

ــ خوف کی کیا بات ہے . بھابی صاحبہ تو بڑی شریف خاتون ہیں .

خوف کس بات کا ؟ ظاہر میاں کی بیوی کلثوم بی بی تو شریف خاتون ہیں .

ــ شریف آدمیوں کا آجکل پیٹ بھرنا مشکل ہے ،

ظاہر میاں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ــ دیکھو شریف

آدمی کے ہاتھوں پیچیدہ معاملات حل نہیں ہوا کرتے۔

غالباً لالٹین میں تیل نہیں ہے اسی لئے روشنی مدھم ہوتی جارہی ہے۔ سایوں کی طرح دو خاموش مورتیں۔ لانچ کے انجن کی آواز قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ ظاہر میاں نے دونوں آنکھیں بند کر کے گھٹنوں پر تھوڑی جمادی۔

رات کے تاریک سائے گلے مل رہے تھے۔ ابر کے ٹکڑے پھر اٹھ اٹھ کر آنے لگے تھے۔ برسات کا غیر یقینی آسمان۔ طوفان میں دیر ہی کتنی ہے

دور افق میں سخت تاریکی کے اندر خاموش پھیلی ہوئی رانگامائی کی نیچی اونچی پہاڑیاں خوفناک طور پر تہوں پر تہیں چڑھاتی جارہی ہیں۔ خفیف ابر کی چادریں پہاڑ کی چوٹیوں پر اس طرح پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے تاریکی کے مجسمے پہاڑی درختوں کے ساتھ حق ہمسائگی ادا کر رہے ہیں۔ اک ذرا اشارے میں ابر کا ایک آوارہ ٹکڑا اپنے وجود کا یقین دلاتے ہوئے رفتہ رفتہ حبشی گھٹاؤں کے دھانے میں روپوش ہو گیا۔

اس جانب دو سائے جیسی مورتوں کے خاموش مجسمے اور ان کا منظر۔

بندرگاہ کی دوسری جانب دن کے تابناک مناظر۔ ایک غیر ملکی جہاز کی خیرہ کن بتیاں، بندرگاہ کی روشنی، جٹی کے پہرہ داروں کی تیز متجسس نگاہوں کی کرنیں ان سب سے مل کر حریفانہ زورآزمائیوں کے درمیان جب کارگو جہازوں کی دھر پد بجانے والی کرخت سیٹیاں بجنے لگتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد دنیا تھر تھر کانپ رہی ہے۔

اب پھر ظاہر میاں نے ادھر اپنی نگاہیں موڑیں۔

دور سے ظلمت شب میں چھپی ہوئی بندرگاہ کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کا روپ۔ نامہم ظلمت شب کی سماج غریب رشتے دار کی طرح انسانی افتخار کے صحن قصر میں داخلے کا انتظار کر رہا ہے۔ لاغر جسم، فکروں کا کھایا ہوا، دونوں سمتیں جیسے دو بدیسی آرکسٹرا آپس میں عجیب و غریب آمیزش کے ساتھ ملتے جلتے آگے بڑھتے جارہیں۔

— میاں بہت دیر ہو گئی۔

— دیر تو ضرور ہو گی۔ اس کا نام سوداگر ہے۔

— وہ سوداگر اچھا آدمی ہے۔

— اچھا، تبھی تو دیر ہوگی۔ کیا کہتے ہو؟

سوداگر اچھا آدمی ہے۔ اسی لئے تو دیر ہو رہی ہے۔ کریم کے گلے میں جیسے الفاظ پھنس کر رہ گئے ہوں۔

— چیلم لاؤں؟

— ٹھیک، دیکھو۔ چولھا ٹھیک کردو۔

ظاہر میاں نے ساتھی کی باتیں کاٹتے ہوئے کہا — وچیلم، ۔ یہ لفظ بھی اس کے ہونٹوں سے ناصاف باہر ہوا — ایک مفقودالخبر پرانے دوست کی طرح جیسے وہ دل کی آنکھوں سے چاول کے نمونے ہی دیکھ رہا ہو۔

شمپان کا دوسرا ماجھی مہاجن سے باقی روپیہ وصول کرنے کے لئے آڑھت میں گیا ہوا ہے۔ وہ چاول خریدے گا۔ یہ دونوں آدمی اسی کے انتظار میں ہیں۔

— بڑی دیر ہوئی۔

— میں نے تو پہلے ہی کہا کہ وہ سوداگر ہے سوداگر روپیہ دے گا تب نا؟

ظاہر میاں نے انکار کرتے ہوئے کہا . نہیں بھئی ، مہاجن ضرور روپیہ اداکردے گا اسی لئے چاول کے سودے میں دیر ہورہی ہے .

سن سن کرتی ہوا کا ایک جھونکا گذر گیا . پھر بارش کا خطرہ بڑھنے لگا . ماہی گیروں کے محلے کے کتے مسلسل بھونکتے جارہے ہیں . ندے کنارے کشتی اور شمپان کے مستولوں پر لگے ہوئے پردے سایوں کی طرح نظر آتے ہیں . کہیں کہیں بانسوں کے ڈھیر ، دوسری طرف چاندنی اندھیرے میں جال بن رہی ہے جس میں بانسوں کے پڑتے ہوئے سائے ایسے جھرنے سے دکھائی دیتے ہیں جو تموج کے لئے منتظر ہوں .

ظاہر میاں کے سر پر کشتی نما ٹوپی ہے ۔ مغرب کی نماز کے بعد اسے سر سے اتارنا بھول گئے . جسم برہنہ ہے جسے دریا کی طرح مرطوب ہوا خنکی پہنچا رہی ہے گمچھا شمپان کے دوسرے کنارے ایک گٹھری میں بندھا ہوا ہے . سستی اور کاہلی کا دور دورہ ہے اس لئے ظاہر میاں نے جسم ڈھانکنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا بلکہ بازؤں کو ہلا ہلا کر جسم میں کچھ حرکت کی حرارت پیدا کرنے لگا.

لانچ کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے- روشنی میں پولیس والوں کا چہرہ نہیں آتا۔ بس گھٹ،گھٹ کی آواز جس سے ملاح اصل حقیقت سمجھ جاتے ہیں.

ساتھی کریم کو شمپان میں گھستے دیکھ کر ظاہر میاں نے کہا۔ ذرا گمچھا دینا.

مگر اس سے بھی زیادہ اضطراب کے ساتھ اسنے کہا۔ "ذرا گٹھری اچھی طرح دیکھنا" دوپہر کی بارش کے وقت وہ ادھر

توجہ نہ کر سکا تھا . گٹھری میں بچے کے پڑھنے کی ایک کتاب تھی . ممکن ہے وہ بھیک گئی ہو .

ظاہر میاں اس تصور کو برداشت نہ کر سکا . وہ خود ہی شمپان میں گھس پڑا .

" بھائی جان ! کتاب کے اوراق پانی سے بچے ہوئے ہیں " ساتھی نے اندر سے آواز دی .

اعتبار نہ کر کے ظاہر میاں خود ہی گٹھری ٹٹولنی شروع کردی. نہ جانے کس دشواری سے اس نے بچے کے لئے کتاب خریدی ہے . اس ایک روپیہ میں سوا سیر چاول خریدا جاسکتا تھا. کلثوم سے اس بات پر چخ چخ بھی ہو سکتی ہے . پیٹ کا کھالا مار کے تعلیم دلانے پر وہ راضی نہیں . عورت کی ناقص عقل .

ظاہر میاں نے ایک ایک ورق الٹ کے کتاب دیکھ لی . کہیں نمی تک کا نشان اس پر نہ تھا . کریم ہسنے لگا .

ــ بھائی آپ کا کام دیکھ کے ہنسی بے اختیار چلی آتی ہے .

ــ کیوں نہیں بھائی ، بچے کی کتاب ہے نا ،

کریم نے مذاق کیا ــ " ارے میں تو سمجھا اس میں کچھ موتی جواہرات ہیں "

ــ آں ، آں ، بچے کی کتاب ہے بھائی .

ظاہر میاں کے بچے سمیرالدین کی کتاب .

ــ ٹھیک ہے ؟

ــ بے شک ٹھیک ہے .

دونوں شمپان سے باہر نکلے . لالٹین کی لو اب بجھنے ہی پر ہے . کریم نے ہلا کے دیکھا کہ تیل نہیں ہے . لالٹین بجھ گئی.

ــ دیاسلائی ہے ؟

ــ ہاں

ــ جواب ملا ــ " ہاں " .

" دیکھو دیا سلائی بھیگ نہ جائے . مہاجن کے یہاں سے ساتھی کی واپسی پر کھانا چڑھانا ہوگا . موجوں کے اس زور میں گھر لوٹنا مشکل ہے . ظاہر نے ہوشیار کر دیا .

ــ بھائی جان ! سمیرالدین مکتب میں پڑھتا ہے ؟

ــ ہاں. ذہن خوب تیز ہے. مولوی صاحب بھی کہتے تھے

ــ غریب کے گھر ذہین بچہ خدا کی رحمت ہے .

ــ ذہن تیز ہونے سے کیا ہوتا ہے . بھلا میں لکھا پڑھا سکوں گا .

ــ بھائی جان اللہ مالک ہے نیت رکھئے تو وہ پورا کردے گا.

ظاہر کچھ دیر خاموش رہ کے پھر بولا ــ " سوداگر کے گھر اتنی دیر؟ شاید آج نہ آسکے گا ". کریم مہاجن پر گالیاں برسانے لگا .

میاں چپ رہو . فضول گالیاں دینے سے کیا فائدہ ؟

کریم زیر لب اپنے غیض و غضب کا اظہار کرنے لگا .

مگر ظاہر میاں کشتی کے سرے پر خاموش بیٹھا رہا . جسم کو گمچھا گرمی پہنچا رہا ہے . آج اسے گھر لوٹنا چاہئے تھا . گھر پر ایک پیسہ دیکے بھی نہیں آیا تھا . کلثوم کہاں ہاتھ پھیلائے گی اسے قرض دینے کے لائق ہے بھی کون ؟ پڑوسی خود اپنے ہی حال میں پریشان ہیں . سمیر بھی باقاعدہ مکتب نہ جاسکے گا . مولوی صاحب نے کہا تھا کہ ایسا تیز اور ذہین لڑکا انہوں نے زندگی میں نہیں دیکھا . کسی طرح اس کے لکھنے پڑھنے کا اگر خرچ پورا ہو سکے تو وقت آنے پر وہ ایک بڑا افسر بن سکے گا . ظاہر میاں

مستقبل کے سراب زندگی میں مسرتوں کی لہریں دیکھ کر اور اپنی موجودہ مصائب سے بھری زندگی کا تصور کر کے ایک مستقل کوفت محسوس کرنے لگا. مہاجن کا روپیہ باقی چھوڑنے میں بھی نقصان نہ تھا مگر کچھ چاول لے کے اسے گھر لوٹنا چاہئے تھا . پاس میں کچھ روپیہ موجود بھی تھا. کیا کہے ، ساتھی ایسا بیوقوف کہ خوامخواہ دیر کر رہا تھا. تین ہمراہی کے بغیر کشتی کا وزن ٹھیک رکھنا بھی ممکن نہ تھا .

آسمان پر چاند بھی نہ تھا . اب تو جوار کا وقت بھی متعین کرنا مشکل تھا . چاند دیکھ کر ظاہر میاں جوار بھاٹے کا صحیح وقت بتا سکتا تھا .

ندی کی سطح پر ابر کے ٹکڑوں کے سائے متحرک تھے . دور افق میں بہاڑکی لکیریں مدھم پڑتی جا رہی تھیں . ابر ایک تموج آفریں سمندر کی طرح اپنی گرج دکھاتا بڑھتا آرہا تھا . ہوا کے تیز ہونے اور پھر موسلا دھار بارش کی کسر ہے .

شمپان کے اندر دو آدمیوں کے دلوں میں البتہ خوف و ہراس کا کوئی سایہ تک نہیں ہے. ساتھی کی واپسی کے انتظار نے دوسرے تفکرات کو ماند کر دیا ہے .

لانچ اب بالکل پاس آگیا تھا . دریا کی سطح ہر طرف اندھیری تھی تاہم انجن کی گھٹ گھٹ آواز اور اس کے ساتھ بھاپ کی چمنی سے شوں شوں کی نکلتی ہوئی چیخ ملاحوں کے دلوں پر کسی فریب کا جال نہیں بن سکتی .

ــ اب نزدیک آ گیا ہے .

ــ آنے دو ہمارے پاس ہے ہی کیا ؟

ــ لالٹین نہیں ہے اس لئے شک ہو سکتا ہے .

ــ اتنا ڈر کس بات کا ؟ ہم نہ افیم بیچتے ہیں نہ گانجا .

کریم اک ذرا بد مزاج نوجوان ہے اور آواز میں تیزی ہے. اس نے ذرا زور دے کے کہا ــ " ظاہر بھائی ، ڈر کس بات کا؟"

ماہی گیروں کے محلے میں ڈگ ڈگ ڈھول بج رہی تھی . اوپری ابر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اڑ گیا . ڈوبتی ہوئی چاندنی ایسا معلوم ہونا تھا کہ بھوتوں کے کندھے پر سوار ہے . آسمان کا خوفناک چہرہ پھیکا پڑ چکا ہے . سیاہی مائل دریا کا پانی رات کی دنیا کا پس منظر تحریر کر رہا ہے.

ظاہر میاں بے خیالی کے عالم میں ہیں. اتنی رات گئے گاؤں کا راستہ کھوٹا ہوا . ندی نالے سب بارش کے پانی سے بھرے ہوئے ہیں . مینڈکوں کی آواز پر سانپ ہر طرف لہرا رہے ہیں . مجید ابتک واپس نہ آیا . نہیں، نہیں ، آج گھر واپسی نصیب نہ ہوگی دیئے کی روشنی میں سمیر اپنا سبق یاد کر رہا ہے. کلثوم اسے تاکید کر رہی ہے کہ کراسن جل رہا ہے جلدی پڑھنا ختم کرو جلدی ..

لانچ بہت قریب آگیا ہے مگر کچھ اندازہ کرنا مشکل ہے ظاہر میاں کے سینے میں فکروں کا تلاطم ہے . انھوں نے تیز نگاہوں سے بیداری کا ثبوت دیتے ہوئے دریا کی سیاہ سطح پر متلاطم موجوں کی طرف دیکھا ، نہیں یہاں آنکھوں کی حس بیکار ہوگئی ہیں .

ــ کسٹمز جہاز آگیا .

ــ ہوں

تاریک ندی کی سطح پر یک بیک نورانی شعاعوں کی بارش ہوگئی . متجسس روشنی نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے . کچھ دیر کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا . پچاس ساٹھ فیٹ کے فاصلے پر بحری پولیس کا لانچ آپہنچا . ڈک میں روشنی ہو رہی

ھے لانچ کے مالک ٹارچ کی روشنی پھینک رھے ھیں۔

رات کی پکار کپکپی پیدا کر رھی ھے۔ او شمپان کے ملاح۔

ظاھر میاں کے شمپان پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ اردگرد اور بھی متعدد شمپان موجود ھیں۔ نہ جانے کس ملاح کو یہ پکار رھے ھیں۔

ــ او شمپان کے ماچھی۔ ای۔ ای۔ ای۔

ظاھر میاں کے ساتھی نے چیخ کر جواب دیا ــ کیا کہتے ھیں ؟

لانچ کے ڈک پر دو تین کانسٹبل، ایک افسر، ان کے جسم پر ھاف پینٹ، ھاف شرٹ، کمر میں پیٹی اور اس پر غیرملکی بلا۔ بجلی کی تیز روشنی میں ھر چیز نمایاں نظر آتی ھے۔

کانسٹبل چیخ کر پکار رھا ھے ــ او شمپان کے ماچھی۔

کریم نے ھر مرتبہ پوری طاقت سے جواب دینے کی کوشش کی۔ کوئی نہ سمجھ سکا کہ اس چیخ و پکار کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ کانسٹبل پکارتا ھی جارھا ھے۔ گویا آج اسے گنگا کے سب ملاحوں اور ان کے ان گنت بچوں کی ضرورت ھے۔

کیا جان دیکے چیخ رھے ھو ؟

ظاھر میاں کہنا ھی چاھتا تھا کہ کریم نے اسے منع کیا۔

ــ بیٹھو۔ ان سالوں کے گلے میں جیسے گرامفون کی مشین لگی ھوئی ھے۔

ــ میں جواب دوں ؟

ــ نہیں بھائی جان۔ ڈر کس بات کا؟ اگر ھم کوئی بےقائدگی کریں تو ڈریں بھی۔

ظاھر میاں مستول کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑا ھوگیا۔ وہ خائف تھا

خوف اور زیادہ ہوگیا . یک بیک لانچ کی روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی . گھڑر گھڑر کی آواز آنے لگی جیسے لانچ کے ڈینے موجوں کو کاٹ رہے ہیں . ندی پر کاجل کا کھیل اور زیادہ شروع ہو گیا .

ــ بتیاں گل کردیں ، ہاں .

ــ سالے کا کچھ مطلب ہے .

معلوم ہوتا ہے کہ مزید قربت حاصل کرنے کے لئے شمپان کے نزدیک پہنچ کر بتیاں پھر جل اٹھیں . شمپان سے محض چند ہاتھوں کے فاصلے پر .

ڈک کے اوپر سے ایک کانسٹبل نے کہا ــ ارے اس قدر آواز دینے پر بھی جواب نہیں ملتا . کان میں سوراخ نہیں ہے ؟ منھ میں زبان بھی نہیں ؟

ظاہر میاں نے کہا ــ جواب تو دے رہا ہوں .

ــ جواب دیا ہے تب تو ہمارے ہی کانوں میں سوراخ نہیں ہے؟

ــ حضور ، میں جھوٹ نہیں کہتا .

ــ " قریب آؤ " . لانچ سے ایک آواز آئی .

اب پھر لنگر اٹھانے کا ہنگامہ . ظاہر میاں ادھر ادھر کرنے لگا .

ــ حضور ، لانچ ادھر لائیے ، پانی کا زور زیادہ ہے .

کانسٹبل اور افسر سب ہی گیٹ پر کھڑے ہیں . سب کے ہاتھوں میں ٹارچ ہے .

ــ لنگر بڑھادے .

ــ مشورہ غلط نہیں ہے . ظاہر میاں نے لنگر بڑھا کے شمپان لانچ سے بھڑا دی . ایک کانسٹبل لانچ سے شمپان پر کود پڑا .

ایک دوسرے کانسٹبل نے کہا ــ اسقدر پکارا روشنی کیوں

نہیں جلاتا ۔ آ ، لانچ پر آ ۔

ظاہر میاں لانچ پر چڑھ گیا ۔

وہ افسر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا ۔

ــ اے ماجھی ، شمپان میں روشنی کیوں نہیں ہے ؟

حضور کراسن نہیں ہے اس لئے اندھیرا ہے ۔

ــ جھوٹ ۔

ــ حضور ــ اللہ کی قسم ۔

ــ بد تمیز ــ اللہ کا نام لیتا ہے ۔

سگریٹ پی رہا ہے ۔ پوچھا ــ نماز پڑھتے ہو ؟ پینٹ بوٹ میں ملبوس

ــ جی ہاں ۔

ــ ہاں ، تم ، تم ۔

ــ حضور میں پنجگانہ نماز قضا نہیں کرتا ۔

ــ بوٹ والا ہنسا ، اچھا بتاؤ شمپان میں افیم ہے ؟

ــ نہیں حضور ، یہ بانس لیجانے والی ناؤ ہے ۔

ــ سوال کرنے والے نے دھمکی دی ۔ شمپان میں افیم ہے ؟

ظاہر میاں خوف سے لاجواب ہوکر پوچھنے والے کے چہرے کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا ۔ نرم و نازک جسم ہے مگر آواز ایسی کرخت ۔

ــ جواب نہیں دیتا ؟ شمپان میں افیم ہے ؟

ــ نہیں حضور ۔

کیا لانچ دیکھ کر ندی میں پھینک دیا ہے ۔

ــ اگر اعتبار نہ ہو تو آپ خود تلاشی لے لیجئے ۔

شمپان میں کانسٹبل موجود تھا ۔ اسے آواز دے کر کہا اچھی

طرح دیکھو۔

جواب آیا ــ جی اچھا۔

ــ تمھارا لائسنس ھے ؟

لنگی کے ایک کھونٹ سے اس نے ایک چرکٹ جیسی چیز نکالی اور کہا ــ اس میں کچھ جوا چوری نہیں ھے حضور۔ شمپان کے اندر سے کانسٹبل نے پکارا ــ نہیں کچھ نہیں ھے۔

بوٹ والے نے سگرٹ منھ سے ھٹا کے پکارا ــ کانسٹبل، شمپان کا تختہ سونگھ کے دیکھو افیم کی بو ھے کہ نہیں؟ پھر برداشت نہ کرتے ھوئے خود بھی دو کانسٹبلوں کو ساتھ لئے شمپان میں کود پڑا۔ ظاھر میاں کی حفاظت کے لئے ایک کانسٹبل لانچ پر رہ گیا۔

کانسٹبل اکڑو ھو کو شمپان کے تختوں کو سونگھنے لگے۔ پولیس کے خوف سے افیم اگر پانی میں پھینک بھی دی جائے تو آسانی سے اس کی بو نہ جا سکے گی۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ایسے مواقع پر ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ کتوں سے کام لیا جاتا ھے۔ یہاں البتہ کوئی کتا نہ تھا ایک کانسٹبل شک کی بنا پر چلایا۔ سر

سرشمپان کے باھر تھے اور کانسٹبل چھاؤنی کے اندر تلاش میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک گٹھری ھاتھ میں لئے باھر آیا۔

ــ سر، اس کے اندر سے افیم کی بو آرھی ھے۔

ــ چلو لانچ پر کھول کے دیکھا جائے۔

مگر ان میں صبر کہاں ؟ کانسٹبل گٹھری کھولتے کھولتے لانچ پر چڑھنے لگا۔

ظاھر میاں بیوقوف کی طرح اس جانب دیکھ رھا تھا۔ یک بیک وہ ھائیں ھائیں کہہ کے چلا اٹھا۔ صاحب آھستہ کھولئے۔

— آهستہ!

بوٹ والے نے پورے زور سے اس کے منھ پر ایک تمانچہ رسید کیا۔ ساتھیوں کی رگ ہمت بھی جاگ اٹھی۔ اور کئی ایک نے اپنا حصہ ادا کیا

— سالا جھوٹ بات کرتا ہے۔

— کان پکڑ کے ظاہر میاں کے چوتڑوں پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔

مگر ظاہر میاں اس سے متاثر ہونے والے نہ تھے۔

— صاحب اسے آہستہ کھولئے۔ اس میں میرے بچے کی کتاب ہے۔

— کتاب ہے اور افیم ہے؟

ایک بار پھر طنز اور لاتیں وزنی بوٹ کی ٹھوکریں۔

— حضور، مار لیجئے، مگر دیکھئے کتاب پانی میں نہ گرے۔

کریم کو بھی پکڑ کے لانچ پر لایا گیا۔

حضور، میں افیم کھاتا ہوں۔ پیٹ کی بیماری کی وجہ سے افیم کھایا کرتا ہوں۔

ظاہر میاں نے ذرا زور کی آواز سے کہا اور یہ معلوم ہے کہ مظلوم کی چیخ بھی ظالم کے لئے قابل برداشت نہیں ہوا کرتی۔

گٹھری کھولی گئی ظاہر میاں نے جھوٹ نہیں کہا۔ سال کے پتے پر دو آنہ بھر افیم تھی۔ اسے اکثر پیٹ کی شکایت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کی دواؤں سے فائدہ نہیں ہوا۔ اب افیم اس کا علاج ہے۔ اک ذرا سی کھا کر اچھا رہتا ہے۔ بنگال کے دیہاتوں میں افیم کو افیم سمجھا بھی نہیں جاتا۔ ایک پیٹنٹ دوا۔ بیماری، غم اور دکھ کا مداوا۔

تونے جھوٹ تو کہا ــ کانسٹبل ذرا مفلر لاؤ ۔ بہت ٹھنڈ معلوم ہوتی ہے ــ شمپان میں افیم نہیں ہے !

ــ حضور ، چوری کی افیم کہاں ہے ! ظاہر کانپ رہا تھا۔ یہ باتیں بھی بے ساختہ منہ سے نکل گئیں

مفلر لگایا جا چکا ۔

ــ سب جھوٹ ۔ تھانے چلو ۔

ــ حضور ۔

ایک کانسٹبل کریم کو انجن والے کمرے کی طرف لے گیا یہاں ذرا اندھیرا تھا ۔ نیچے موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں ۔

ــ میاں بندوبست کرو ۔ تھانے جانے میں ہزاروں بکھیڑے ہیں ۔ ایک دن کی مزدوری تو یونہی جائے گی ۔ دیکھو شور چھونے کا . . . .

ــ بے قصور ۔

ــ ارے تیرا بھی قصور ۔ بیہودہ کہیں کا ۔ میں سب سے کہدوں گا کہ اب کی چھوڑ دیجئے ۔

ندی کے کنارے سے بار بار یہ آواز آرہی تھی او شمپان کے کے ماجھی ، او شمپان کے ماجھی کنارے آؤ ۔

یہ مجید کی آواز تھی ۔ بھلا ایسے میں کون جواب دیتا ۔

ــ اے شمپان کے ماجھی ــ کنارے آؤنا

آواز رک گئی ۔ جواب دینے کی کیا صورت ہے ۔ کریم ایک طرف گوش برآواز اور پھر اسے معاملات بھی طے کرنا تھا ۔

ــ ظاہر بھائی ، شمپان کنارے پر لگاؤ ۔

کانسٹبل پھر ظاہر کو انجن کے کمرے کی طرف لے گیا ۔ جاتے ہی کریم نے ۔ کچھ روپئے ہیں !

ـــ ہاں ۔

شمپان کو دھکا دے کر ظاہر میاں تختوں پر جا بیٹھا ۔ اس کا سر گھوم رہا تھا ۔ یک بیک نیم خوابی کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا ۔ ارے بھائی میری گٹھری ۔ میری گٹھری ۔ میری گٹھری وہ ہاتھ ملنے لگا ۔ ہائے ہائے ، اس میں میرے بچے کی کتاب تھی ۔

ظاہر میاں نے ہراشتیاق نظر ڈالی ۔ لانچ چلا جا رہا تھا ۔ ندی کے دونوں جانب ظلمات کی پریاں ناچ رہی تھیں ۔

ـــ میری گٹھری ۔

اور کوئی وقت ہوتا تو کریم ہنسی سے دوہرا ہوجاتا ۔ مگر ایسا بے خیال ، آپے سے باہر اور مغموم انسان ۔

وہ خاموش رہ گیا ۔

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے ۔ جیسے کوئی ایسا اہم واقعہ ہو گیا جو سمجھ سے باہر ہے ۔

ـــ اے شمپان کے ماجھی ، کنارے آؤ ، میں مجید ہوں ۔ اے . . . . ظاہر میاں نے لنگر کھول دیا ۔

دوسری صبح ظاہر میاں اپنے گاؤں پہنچا ۔ وہاں اس نے طوفان کی مہربانیاں دیکھیں ۔ گرے ہوئے درختوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں سے راستے بھرے پڑے تھے ۔ صحن میں سپاری کے درخت کا سرا اوندھے منہ پڑا تھا ۔ لنڈ منڈ درخت کھڑا اپنی تباہی کی کہانی سنا رہا تھا ۔ دیواروں پر چمکنے والی شعاعیں ضیاپاشیاں کر رہی تھیں ۔ ایک گوشے میں سمیرالدین بیٹھا تھا جس کے سامنے کتاب کا دفتر کھلا تھا ۔

جمائی لے کر اس نے جو نظر گھمائی تو بے ساختہ کمال

مسرت سے "اباجان" چیخ پڑا ۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا ہی رہا۔ اس نے سوچا کہ پڑھنا چھوڑ کر اگر وہ اباجان کی خاطرداری میں لگ گیا تو اسے جھڑکی سننی پڑے گی ۔

ـ ابا ، میری ۔ ۔ ۔لائے ہیں ؟

نہ جانے سمیر کیا چیز لانے کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ اس اثنا میں ظاہر میاں گھر میں داخل ہوچکا تھا ۔ ابھی وہ باہر سے لوٹا ہے ۔

ـ تیری ماں کہاں گئی ہے ؟

ـ ابا جان قرض مانگنے ۔

کلثوم صبح ہی سے قرض لینے کی فکر میں گھر سے باہر گئی تھی ۔

ظاہر میاں پھر گھر میں گھسا ۔ اسے پیاس لگ رہی ہے ۔ گھڑے میں پانی نہ تھا ۔ وہ فوراً باہر نکلا ۔

ـ ابا ، میری کتاب لائے ؟

ـ حرامزادہ ۔ کتاب ! اڑجا کہیں ۔ آڑ نہیں سکتا ؟

ـ ابا ، میں تو پڑھتا ہوں ۔

ـ پڑھتا ہے ۔ پڑھ کے کیا ہوگا ۔ آڑجا حرامزادہ ۔ جا ، تیری ماں کو بلا لا ۔ "پڑھتا ہوں" ارے پڑھ کے کیا ہوگا ؟ خوف زدہ سمیرا بیٹھا رہ گیا ۔ باپ کا ایسا مزاج اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ـ میں پڑھتا ہوں ۔ آڑجا ۔

حیران سمیر ۔

ظاہر میاں کہتا ہی جا رہا ہے۔ پڑھ کے کیا ہوگا ۔ علم علم کی مار سے سوٹ بوٹ اور پھر رشوت ۔ علم بے کار ، علم کی ضرورت نہیں ہے ۔ آڑجا ، پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔

آج کچھ بھی سمیر کی سمجھ میں نہ آرہا تھا. خوف سے وہ ایسا نظر آتا جیسے کاٹھ کی مورت .

ــ جلدی آڑجا . بھاگ .

سمیر اب کی بار کھڑا ہوگیا . اس کا چہرہ فکروں سے ستا ہوا .

ــ سالے کا بچہ ، کسی کو بلا نہیں سکتا ؟ پڑھ لکھ کے کیا ہو گا ؟ تو پڑھتا ہے . اچھا رہ . . . . یہ کہتے ہی گٹھری کھول کے ظاہر میاں نے نئی کتاب نکالی اور اسے کر کر آواز کے ساتھ پھاڑ ڈالا. کمانے کی فکر نہیں پڑھنے کی فکر ؟ پڑھ لکھ کے کیا ہوگا ؟

یکایک اس کی نظر پڑی سمیر کی کتابوں پر ، کاپیوں پر . کئی کتابیں کھلی پڑی تھیں اس نے جھپٹ کے انھیں اٹھا لیا اور جیسے گدھ کسی مردار کی آنتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کے نوچتا ہے. اسی طرح اس نے ان کتابوں کو بے دردی سے پرزے پرزے کرڈالا .

اس کے منھ پر ہوائیاں اڑرہی ہیں ــ سالا علم. سوٹ بوٹ اور رشوت . پھراس نے ایک ناقابل نقل گالی دے کر کہا ــ سوٹ پیچھے اور رشوت پہلے . اس علم سے کیا حاصل ؟ بدذات ۔ (سمیر کی جانب دیکھ کر) اپنی ماں کو بلالا . آڑجا حرامی کی اولاد ۔ آڑجا .

فرخ احمد

۱۹۱۸ء میں ضلع جیسور کے موضع آئل میں فرخ احمد کی ولادت ہوئی مشرقی پاکستان کے جدید شعرا کی صف میں فرخ احمد ایک ممتاز مقام کے مالک ھیں ۔ ان کے انداز بیان میں ندرت کے ساتھ نمایاں دلکشی ھے اور یہی سبب ھے کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں کے دلوں میں اتار دیتے ھیں ۔ اسلامی تہذیب و ثقافت پر ان کی خاص نظر ھے اور اسی لئے وہ کوشش کر کے ایسے الفاظ بڑے سلیقہ سے استعمال کرتے ھیں جن سے اسلامی تہذیب و تمدن پر ان کی وسعت نظر کا اندازہ ھوتا ھے ۔ عشقیہ شاعری ، گانے ، بچوں کی نظموں اور طنزیہ شاعری کے لئے فرخ احمد خاص طور پر شہرت رکھتے ھیں ان کی ــ " سات ساگر ابرماجھی ، سراجامنیرا ، نوفل و حاتم وغیرہ منظوم کتابوں نے بنگالی ادیبوں سے بہت زیادہ خراج تحسین حاصل کیا ھے ۔ ظریفانہ انداز نظم میں " حیات دراز " کے فرضی نام سے ان کی نظمیں بڑی شہرت پاچکی ھیں ۔ فرخ احمد مختلف حیثیتوں سے ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رھے ھیں ۔ موجودہ وقت میں وہ ریڈیو پاکستان کے ایک کامیاب نظم نویس اور علمی تحریروں کے بااثر مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کر رھے ھیں۔ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے صدر کا انعام حاصل کیا ۔

مرتیو بشودھا (مردا زمیں)

ندی کے کنارے پرانے پکڑ کے درخت کے نیچے شام کو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس منعقد ہوا کرتی ہے۔ ان لوگوں کی جو موت کے محل کی طرف قدم بڑھا چکے ہیں یا وہ جو زندگی کے کنارے تک پہنچ رہے ہیں، ایسے مسافروں کے آخری قافلے اسی طرح کی محفل جمایا کرتے ہیں۔ یہاں وہ نوجوان نہیں آتے جو جوش شباب میں بوڑھوں کے جھریائے جسم پر پھبتیاں کسا کرتے ہیں، بھر پور شباب کی وجہ سے وہ بے پروا لوگ جو بڑھاپے کے بیمار لوگوں کو دھکے دیکر پیچھے ہٹا دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ روز بروز بیماریوں کے ہاتھوں شکستہ تر ہونے والے والے اور قبل از وقت ضعیفی کی حدوں میں داخل ہوجانے والے ہی اس محفل میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ اور بار بار ایک ہی قصہ دہراتے ہیں انہیں نئی کہانیاں کہنے اور نئی راہ پر چلنے کی ممانعت ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی نگاہیں ہمیشہ ماضی کی دھندلی تصویروں ہی جمی رہتی ہیں۔ انہیں یاد آتا ہے کہ وہ ماضی جو بھیانک نشیب و فراز سے بھرا ہوا ہے۔ ماضی کی وہ زندگی جو غیر معمولی طاقتوں سے بھر پور تھی نوجوانوں کی سر پھری جماعت اوران کی دھندلی

دھندلی صورتیں زندگی کے پر مسرت لمحات اور اب بدلے ہوئے حالات میں ان کی شیریں یاد۔

بہت دنوں پہلے ان لوگوں کی زندگیوں میں بھی ایک طوفان آیا تھا۔ مگر اب وہ طوفان بالکل پرسکون ہوچکا ہے۔ آج ان کے وہ ظلم باقی نہیں، وہ بل نہیں یہاں تک کہ ان مظاہروں کے کے نشانات بھی باقی نہیں ہیں۔ سب مٹ چکا ہے۔ اب انہیں تمام جوش و خروش سے فارغ ہوکر منزل کا انتظار ہے۔ زندگی کیا ہے تمام لذتوں سے خالی، خاموش اور بے کیف۔ پھر بھی ایک سکون محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شدید بارش کے بعد آندھی کا زور ختم ہوچکا ہے۔ انتہاہ خاموشی میں ایک ٹھنڈی ہوا اسی طرح بہتی چلی جارہی ہے جیسے نراس زندگی آخری سکون کے لئے آہستہ آہستہ دم توڑتی ہے۔ خاموش قدموں سے موت نزدیک چلی آرہی ہے۔

اس جماعت کے ایک صاحب ــ سونا گاؤں کے بوڑھے قاضی صاحب ہیں۔ ان کی لمبی سفید داڑھی۔ سفید پوشاک جیسے بڑھاپے کا مخلوط تخیل۔ انہیں دیکھنے سے دل میں ایک جذبۂ عقیدت پیدا ہوتا ہے۔ بہت ساری آندھیوں اور طوفانوں سے گذرکر ان کی زندگی اس بندرگاہ سے آلگی ہے جہاں سے تاریک سایوں کے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ نا امیدی کے عالم میں موت کے خاک آلودہ منہ پر کھڑے ہوکے وہ غالباً اور کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ ابتو وہ شاید خاموش موت کے انتظار ہی میں دن گذار رہے ہیں۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ موت بھی بڑی سخت جان ہے اور وہ اتنی مصیبتوں کے بعد آتی ہے۔ موت سانس بند نہیں کرتی بلکہ اپنے آہنی پنجوں سے سانس کو نوچ نرچ کر باہر نکالتی ہے۔

دمے کی شدت میں وہ جس وقت ہیجان خیز کھانسی میں مبتلا ہوتے ہیں اس وقت یہی بات انہیں یاد پڑتی ہے ۔ بعض بعض وقت یہ دمہ بڑا صعوبت آفریں بنجاتا ہے جیسے سخت گرمی کی دوپہر کبھی آمس لئے آتی ہے اسی طرح یہ دمہ ہے ۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینہ ہوا سے بالکل خالی ہوجاتا ہے ۔اس کے بعد یک بیک ایک آندھی کی طرح سانسوں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے جیسے بیساکھ کے طوفان میں درخت کے سوکھے پتے لرزاں رہتے ہیں ۔ اسی طرح ان جھٹکوں سے سینے کے انجر پنجر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں ۔ کھانستے کھانستے جسم جھک جاتا ہے ۔ نیم مردہ ڈھانچہ خم ہوجاتا ہے کیوں کہ موت کے سنگدل ہاتھوں نے اس کا ٹیٹوا دبا دیا ہے ۔ پھر گلے میں پھنسی ہوئی غرغراہٹ اور پھر تازہ تازہ خون ابل پڑتا ہے جس سے سفید پوشاک اور سفید داڑھی مونچھ بھیگے ہوئے تازہ خون میں لت پت ہوجاتے ہیں اور سارا جسم اس طرح بے جان ہو کر گر پڑتا ہے جیسے سخت طوفانی بارش سے زمین پامال ہونے کے بعد بھیگ کے افسردہ ہوجاتی ہے ۔ عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی ہے اور اب قاضی صاحب کو بہت سخت تکلیفیں اٹھانی پڑرہی ہیں ۔ انہیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ قدرت کی ستم آفرینیاں کس قدر انسانیت سوز ہیں۔ لیکن اس کا شکوہ کرنے کی بھی انہیں ہمت کہاں ہے ؟ وہ کس کے خلاف شکایت کریں گے؟ جس نے اپنی ساری جوانی مدہوشی اور بےفکری کی نذر کردی ہو وہ اگر بڑھاپے میں غیر معمولی تھکن محسوس کرے تو اسے شکایت کرنے کا حق ہی کیا ہے ؟ پھر شکایت بھی تو کس سے ؟ ان کی آج کی زندگی قدیم بنجر زمین کی طرح فصلوں سے محروم اور غیر

زرخیز ہوگئی ہے ایسی بنجر زمین جس میں نہ کوئی فصل پیدا ہوتی ہے، نہ پھول پھولتے ہیں اور نہ پھل لگتے۔ وہ خلائے بسیط کی طرف اپنے زیادہ خالی ذہن کے ساتھ تکنے لگتے ہیں۔

مگر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ قاضی صاحب بڑی طاقتوں کے مالک تھے۔ ان میں غیر معمولی حسن تھا۔ انھوں نے وہ زندگی پورے عیش و آرام کے ساتھ گذاری ہے جب تک طاقت تھی وہ بے اصول اور ننشدد تھے۔ اب ناطاقت ہونے پر وہ با اصول اور امن پسند ہوگئے۔ جوانی نے انھیں اپنے اندر جکڑ رکھا تھا۔ وہ جوانی کے ہاتھوں میں اس قدر قید تھے جیسے کوئی شیطان کے ہاتھوں میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ وہ جوانی ہی کے اشاروں پر چلتے پھونے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ انھوں نے اس قید شباب کو کوڑیوں کے مول لا پروائی کی نذر کرتے ہوئے گذارا ہے۔ مگر آج کہاں گئی وہ طاقت اور کہاں گئی وہ غیر مفتوح ہمت۔ ان کی آج کی موت کے منھ تک پہنچی ہوئی زندگی بڑی ہی مایوس کن ہوچکی ہے۔ وہ اپنی جوانی کی غلطیوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہیں مگر انھیں سیری حاصل نہیں ہوتی۔ سکون پانا اب ان کے لئے ممکن بھی نہیں ہے۔ جب وہ ایک غلطی کے توبہ کرتے ہیں تو دوسری بے شمار غلطیوں کی یاد انھیں اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے ان کا خمیر اندر سے روتا ہے اور یہی ان کی تباہ شدہ جوانی کی یادگار کا کام دیتا ہے۔ مرنے کے بعد اگر لازوال شباب حاصل ہوسکتا ہے، امٹ حسن لوٹ سکتا تو بڑھاپے کی سرحد پر پہنچ کون نہ مطمئن ہوجاتا اور یہی اطمینان اس کے خمیر کو سکون بخش سکتا۔ انسان توبہ کرتا ہے، مٹنا نہیں چاہتا ہے معافی اس لئے چاہتا ہے کہ پھر سے نئی زندگی پاسکے۔

قاضی صاحب جب ان باتوں کا محاسبہ کرتے ہیں تو ان کی

نگاہوں کے سامنے ایک ایک کر کے تصویر بن ابھرتی ہیں۔ خود زندگی بھی تو ایک متحرک تصویر جیسی ہی ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے کی باتوں کو عمر اس قدر پیچھے کیوں پھینک دیتی ہے؟ وہ تو آج بھی بلا تردد ان سب باتوں کو دھرا سکتے ہیں۔

اس وقت قاضی صاحب پورے جوان تھے۔ ان کا جسم فولاد کی طرح سخت اور ان کا قد سرو کی طرح سڈول تھا۔ قوی، نڈر اور خوش جمال مرد کی حیثیت سے وہ شہرت کے مالک تھے۔ لیکن ان کی یہ شہرت آس پاس کے لوگوں کے لئے بڑی ہی دہشتناک ہوگئی تھی۔ ان کی بے روک بداخلاقی اور داغدار چال چلن کی وجہ سے وہ بڑی ہی خطرناک ہوگئی تھی۔

اس قرب و جوار میں ان کا سا سدھا ہوا شکاری اور کوئی نہ تھا۔ ان کا گھوڑا سب سے تیز تھا اور ایک شہسوار کی حیثیت سے وہ دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ ان کے مختصر سے گھرانے کے لئے دولت کی کمی نہ تھی۔ بے خوفی اور اطمینان کے ساتھ وہ ہرطرف مظالم کا بازارگرم کئے ہوئے تھے۔ وہ ایک شریف خاندان کے فرد تھے اس لئے ان کی راہ میں روڑا بننے کی ہمت گاؤں کے کسی فرد میں نہ تھی۔ مناسب عمر میں ان کی شادی ہوگئی تھی مگر وہ صوفیہ کو پاکر مطمئن نہ ہو سکے۔ صوفیہ انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتی لیکن روپ کے پجاری خندکار صاحب کا دل صوفیہ کی خود سپارانہ سحرکاریوں سے بھی مطمئن نہ ہوتا۔ اندھیری راتوں میں آٹھ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتے اور صبح ہونے سے پہلے ہی پلٹ آتے۔ صوفیہ سب کچھ جانتی و سمجھتی تھی۔ اس نے اس کے لئے بے شمار راتیں رو رو کے گذاری تھیں لیکن

قاضی صاحب کی قابل نفرت عادت اس کی وجہ سے نہ بدل سکی۔ ان کی آتش نفس کسی رکاوٹ سے سرد ہونے والی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جنسی بھوک نے انہیں خطرناک حد تک از خود رفتہ بنا دیا تھا۔ جس چنچل من کی وجہ سے پرندے اندھیرے منہ گھونسلوں سے نکل کر شکاریوں کے ہاتھوں جان گنواتے ہیں ویسا ہی چنچل من قاضی صاحب نے بھی پایا تھا۔ ان کا عدم سکون نئی نئی گھاتیں، جنسی بھوک مٹانے کی تدبیریں سوچنے میں لذت پاتا۔ جنون کی حد تک بڑھ گئی تھی ان کی شہوانی ہوسناکی اس لئے صوفیہ کی محبت قاضی صاحب کی بے راہ رو ہوسناکی کے پیروں تلے پامال ہو کر رہ گئی۔

قاضی صاحب کی گناہ پرور زندگی کے ہم سفر رفیق انہیں کے چند اوباش پرجا تھے۔ کتنی بار تاریک راتوں میں خاموشی کے ساتھ انہوں نے سیندھ کاٹ کر اور منہ میں کپڑے ٹھونس کر مظلوم لڑکیوں کا ان کے گھروں سے اغوا کیا، ان کی متاع عصمت کو لوٹا ان کی فریادوں کو پیس کر پامال کیا اور ان کی کمزور مدافعت کا مذاق اڑایا۔

جس قصے کا ناسور آج بھی ہمارے دلوں میں نئی کرید کا منتظر ہے اس کی تحقیق بھی اسی طرح ایک عورت کی گم شدگی سے ہوئی۔

انسان کی قسمت کبھی کبھی کسی ایسے غیر مرئی انجذاب سے متعلق ہوتی ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی کبھی اس پر نحوست کے سیاہ سائے منڈلاتے ہیں اور کبھی خوش بختی کے روشن انوار سے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں۔ راحلہ سے قاضی صاحب کی جب پہلی ملاقات ہوئی تو غالباً اسی قسم کے کسی

منحوس سائے نے ان دونوں پر اپنا ناخوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اسی سائے کے اندھیرے میں کچھ دنوں تک تر غیر مہذب بدکاری کا دور دورہ رہا مگر جب اس کا مکروہ چہرہ لوگوں کے سامنے آگیا تو قاضی صاحب کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر گیا۔

راحلہ کے معاملے میں جس قدر بےحیائی اور غیر شریفانہ حرکتوں کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا اتنا اس سے پہلے اور کبھی نہ کیا۔ ایک تاریک رات میں اس دور کی روایات کے مطابق قاضی صاحب کے چند معتمد حواری نے ڈاکہ زنی کر کے اور راحلہ کے منہ پر کپڑے ٹھونس کے جب اسے سونا گاؤں لے آئے تھے اس وقت ان کے دل میں معمولی داغ بھی نہ تھا۔

گھر کا دروازہ جنگلا بند کر کے قاضی صاحب نے جب اس کے منہ کا بندھن کھولا اس وقت ایک بچے جیسا سیدھا سادھا اور بھولا بھالا راحلہ کا چہرہ دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے حیران رہ گئے۔ راحلہ کو اتنے قریب سے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اس کا چہرہ حیرت انگیز حد تک سنجیدہ تھا قاضی صاحب کم زور اور مظلوم راحلہ کو دیکھنے لگے۔ لیکن اس کی وہ کم زوری عارضی تھی۔ اس دن کے قاضی صاحب یہ جانتے تھے کہ جو شخص ظاہری طور پر سنجیدگی کا لباس پہن کر بیٹھا رہتا ہے یا فطرت جسے سنجیدگی کا لباس پہنا دیتی ہے ان لوگوں کی جنسی بھوک کسی اور سے کم نہیں ہوتی۔ راحلہ کو بھی اسی نظر سے دیکھنے میں انہیں دیر نہ ہوئی اور دوسری معصوم دوشیزاؤں کی طرح راحلہ کی پاک دامنی بھی قاضی صاحب کے سیری نایافتہ شباب کے پاؤں تلے پس پسا کر پامال ہو گئی۔

دیہات کے لوگ دوسرے دن ان کی اس درجہ بےحیائی دیکھ کر

حیران رہ گئے : مگر قاضی صاحب کو کسی کی پروا نہ تھی۔ انھوں نے راحلہ کو اپنے گھر میں قید کر رکھا۔ جن چند آدمیوں کے اعتراضات قاضی صاحب کے کانوں تک پہنچے انھیں اپنی اس گستاخی کا پورا پورا ثمرہ مل گیا۔ گاؤں کے متعدد گھروں میں آگ لگتے ہی ساری مخالفت سرد پڑ گئی۔ اس حملے سے مسجد کے امام صاحب بھی محفوظ نہ رہے۔ راحلہ کے باپ کے گھر سے جو لوگ اسے آزادی دلانے کے لئے آئے تھے ان کی ہڈیاں ممکن ہے اب بھی سونا گاؤں کے قریبی جھیل میں مل سکیں۔ انھیں بے شمار گھونگھے، گھاسیں اور لتائیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ پاس کے تھانے والے بھی ایک بڑی رقم بطور بخشش پانے کے بعد اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہ پاسکے۔

باہر کے معاملات تو اس طرح مٹ گئے مگر گھر کے اندر تو وہ اتنی آسانی سے نہ مٹ سکے۔ قاضی صاحب کے سر پرستوں میں صرف ان کی ضعیف والدہ تھیں۔ وہ اور صوفیہ اس معاملے کے بعد اس درجہ دل برداشتہ اور ذلیل ہوئے کہ برادری میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ شرم سے بہو اور خوش دامن خود بھی باتیں کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اس طرح کہ گویا قصور وار وہی تھیں۔ آخر کار صوفیہ نے ایک دن ساری بے عزتی اور شرم کا اس طرح خاتمہ کردیا کہ اس نے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ صوفیہ کی موت کے بعد قاضی صاحب کی والدہ اور زیادہ غمگین ہوگئیں۔ ان کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ وہ دن رات رو رو کر اپنی جان کھونے لگیں یہاں تک کہ خواب خور سے محروم ہوکر انھوں نے موت کی گود میں پناہ حاصل کی۔ قاضی صاحب کے گھر میں ان دو اموات کا تسلسل ایک ایسی بربادی

لایا جس کی یاد بہت دنوں تک بھلائی نہ جاسکی ۔ لیکن قاضی صاحب اپنے حال میں اس طرح مست تھے کہ اس طرف دیکھنے اور سوچنے کی انہیں اس وقت فرصت نہ مل سکی ۔ راحلہ کو پاکر وہ اس وقت بد مست ہو رہے تھے اور سب کچھ بھول گئے تھے ۔

ایک نہایا دھو یا انسان ایک غلاظت آلود سور کو گلے لگانے سے جس قدر متنفر ہو سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ راحلہ قاضی صاحب سے متنفر تھی ۔ راحلہ کی نفرت کسی بھوت کے انتقام اور اس کی دشمنی سے بھی زیادہ خوفناک تھی ۔ اس کا بچوں جیسا چہرہ اب بدل گیا ۔ اس کی جگہ لی ہے تیز خنجر جیسے سخت نشانوں نے ۔ دونوں آنکھوں سے آگ بھری شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ ایک انسان جتنی نفرت کسی سے کر سکتا ہے اتنی ہی نفرت وہ قاضی صاحب سے کرتی ہے ۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس کی آغوش میں مقید پاتی اس وقت اس کی سمجھ اعتدال پر باقی نہ رہتی۔ معلوم نہیں کیسے وہ اس ظلم کو سہارتی ؛ وہ اسی طرح سہارتی جیسے پھولوں اور کلیوں سے بھرا ایک چمن زار زمین کے اندر سے پیدا ہونے والے زلزلوں کو برداشت کرتا ہے ۔ یہی طاقت اس کی مدد کرتی ۔ رات دن وہ موت کی دعائیں مانگتی مگر خودکشی نہ کر سکتی۔ ابتداءاً وہ قاضی صاحب کی شہوت پرستیوں کے روکنے کی جان توڑ کوشش کرتی لیکن اس کی نفرت ، اس کے آنسو اور اس کی جسمانی مدافعانہ طاقت کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی تمام طاقت ایک کچلے ہوئے سانپ کی طرح بے سہارا ہو کر شکستہ ہوگئی۔ اب وہ مدافعت نہ کرتی ۔ وہ قاضی صاحب کے سامنے ہار مان چکی تھی لیکن اس کے تمام جسم کی کمزوری آنش فشاں بن کر اس کی دو آنکھوں

میں نفرت اور انتقام کے روپ میں سما گئی تھی ۔ یہ آنکھیں ہر وقت مشتعل رہتیں ۔

چند مہینوں کے بعد اسے معلوم ہوگیا کہ اس کے جسم کے اندر ایک اور جسم پناہ لے کر آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جارہا ہے ۔ یہ زندہ جسم اور کسی کا نہیں تھا۔ یہ انسان نما حیوان قاضی صاحب ہی کے جسم کا ایک ٹکڑا تھا ۔ قاضی صاحب نے بھی ایک روز اس بات کو بھانپ لیا ۔ اب وہ راحلہ کے بارے میں مطمئن ہوگئے انھوں نے بے نہایت شوق کی حالت میں راحلہ کو اپنایا اور اس کے مطابق اس سے محبت بھی کی تھی۔ غیر معمولی بے راہ روی کے بعد اب نہ جانے قاضی صاحب کے عریاں جنسی شوق کسی پاک و صاف گھاٹ پر پہنچ کر تھما بھی تھا یا نہیں۔ وہ اک ذرا کوشش کرنے ہی سے برادری سے خارج ہوکر جنم لینے والے بچے کا خاتمہ کر سکتے تھے ۔ مگر وہ ابتک ظہور میں نہ آنے والے بچے کے تصور ہی سے پھولے نہیں سمائے ۔ ان کے وحشیانہ سینے میں ایک باپ کی محبت جاگ اٹھی ۔ وہ دوڑ کر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اب وہ راحلہ سے اس لئے شادی کریں گے کہ ان کے ہونے والے بچے کا مستقبل خوش آئند ہو سکے ۔ اس روز تاریک رات میں ان کی نیند ٹوٹ گئی اور انہیں راحلہ کے گھر سے کسی نومولود بچے کے رونے کی مبہم سی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ابھی ابھی جنم لینے والے بچے کی رونے کی آواز ۔ کیا راحلہ کے یہاں بچہ پیدا ہوگیا؟ وہ فوراً ہی روشنی سنبھالے دوڑتے ہوئے راحلہ کے کمرے میں داخل ہوئے ۔ اس طرح ناوقت بچے کی ولادت کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا ۔ راحلہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے دیکھا کہ

تھوڑی ھی دیر پہلے کا پیدا شدہ ایک بچہ زمین پر پڑا لوٹ رہا اور رو رہا ھے۔ قاضی صاحب نے اس کے چھوٹے سے جسم کو زمین سے اٹھالیا۔ ان کا دل سینے میں کانپ رہا تھا۔ مگر راحلہ کیا ہوئی ؟ لالٹین اک ذرا اوپر اٹھانے ھی جو منظر ان کے سامنے آیا اسے زندگی بھر وہ نہ بھول سکے۔ تنہائی اور تاریکی میں انہیں ھمیشہ وھی تصویر نظر آیا کرتی۔ کہیں تنہا سفر کرنے سے بھی انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ وھی شکل چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے سخت بد دعائیں دیتی ہوئی چلی آرھی ھے۔

ساڑی کا آنچل گلے میں باندھ کر راحلہ معلق لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی غیر معمولی لمبی زبان منہ سے باھر نکلی ہوئی تھی جس میں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ دونوں پٹھی پھٹی آنکھیں حلقوں سے باھر نکل آئی تھیں۔ آس کے تمام چہرے پر خوفناک موت طاری تھی۔ موت، خوفناک موت، ایسی خوفناک جس کا صحیح نقشہ ابتک کوئی بھی الفاظ میں نہ کھینچ سکا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں موت کا ایسا بھیانک چہرہ دیکھ کر نڈر قاضی صاحب بھی اپنا دماغی توازن درست نہ رکھ سکے۔ ان کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش کر گر پڑے۔ ان کی چیخ سن کر بہت سے لوگ وھاں اکٹھا ہو گئے۔ انہیں وھاں سے اٹھا کر بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا دوسری صبح جب ان کی بیہوشی ختم ختم ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ رات کی تاریکی ھی میں راحلہ کو سپرد خاک کیا جا چکا تھا۔ قاضی صاحب نے یہ خبر سن کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکے۔ کروٹ بدلتے وقت سارے جسم میں درد کی اک ٹیس دوڑ گئی اور وہ چیخ مار کر گر گئے۔ باتوں ھی باتوں میں یہ خبر ھر طرف پھیل گئی کہ قاضی صاحب ہر جزوی فالج

کا اثر ہوگیا ہے ۔ شہر سے ڈاکٹر بلوائے گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ شدید خوف کی حالت میں گرجانے کی وجہ ہی سے انہیں یہ بیماری لاحق ہوئی ہے ۔ ہاں جانے وقت وہ صحت کی امید ضرور دلا گئے ۔

بہت دنوں تک بچھونے سے لگے رہنے کے بعد اور پانی کی طرح دولت پھونکنے پر جب ان میں کسی قدر چلنے پھرنے کی طاقت آئی تو ان کی جوانی کافور کی طرح اڑ چکی تھی ۔ وہ لاٹھی کے سہارے بغیر چل نہیں سکتے تھے ۔ اب اپنے کبڑے جسم کو گسیٹنے کی طاقت بھی ان میں نہ رہ گئی تھی ۔ ان کی ٹانگیں اب جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کرنے لگیں ۔ جسم ہی کی طرح ان کا دل بھی کمزور اور ہمت بھی پست ہوگئی تھی ۔ جو ایک دن بےنہایت طاقت کے بل پر پہاڑوں کو روندنے کے ارادے لئے سخت مغرور ہو بڑا تھا ۔ وہ آج زمین کے سینے میں پناہ ڈھونڈھتا ہے ۔ آن کے چال چلن میں بے راہ روی اور سختی اب باقی نہیں ہے ۔ آج وہ اتنے نرم ہوچکے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں ایک رحمدل شکستہ خاطر بوڑھے کے سینے میں بدراہ اور مغرور نوجوان دم توڑ چکا ہے ۔

گھر کی بوڑھی نوکرانی پانچیر کی ماں اب راحلہ کی بچی کو پال رہی ہے ۔ قاضی صاحب کسی طرح اس بچی کو اپنی نظروں سے اوجھل کرنے پر راضی نہ ہوئے ۔ چھوٹی بچی اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں سے سارے گھر میں گھومتی پھرتی جب زیادہ آدمی نہیں ہوتے تو وہ پرشوق آواز میں پکارتے ہیں ــ لطیفہ ادھر آ ۔ لطیفہ آتی ہے مگر قاضی صاحب یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے لطیفہ کو کیوں بلایا تھا ۔ بس وہ آس کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے

دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

بندوق میں زنگ لگ گیا ہے۔ اصطبل میں مضبوط گھوڑا کوئی ساتھی نہ پا کے اپنے پیروں کی ٹھوکروں سے انہیں ہلاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھ کر وہ گھوڑے کے پاس جاتے ہیں۔ جوش طاقت سے اس کی ٹانگیں تھرتھرانے لگتی ہیں۔ وہ بڑی محبت بھری نظروں سے قاضی صاحب کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ آس کی تیز دوڑنے کی شدید طاقت آسے پاگل بنا دیتی ہے۔ قاضی صاحب خیالوں کی دنیا آباد کر کے نہ جانے کیا سوچنے لگتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ گھوڑے کی گردن میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔ آس کی بے قراری سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے قاضی صاحب کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔

ان کے کندھوں پر منہ رکھ کے وہ ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ وہ جوانی کا ساتھی ہے اس لئے قاضی صاحب اپنے گھوڑے کے برتاؤ سے خاموش سکون پاتے ہیں۔

قاضی صاحب کی زندگی پر بڑے گہرے زخم پہنچانے والے برسوں کے تیز رو قدم گذرتے رہے۔ وہ دن بدن نرم سے نرم تر ہوتے گئے۔ صحت اور بھی خراب ہوتی گئی۔ لطیفہ زندگی کی ساری بہاریں ساتھ لئے برسات کی ناؤں کی طرح بڑھتی گئی۔ وہ جس قدر بڑی ہوئی آسی قدر غیر متواضع اور سنگدل ہوتی گئی۔ قاضی صاحب آس سے اندھی محبت کرتے تھے مگر وہ ان کی شفقت سے اور زیادہ برافروختہ ہوتی۔ ایک بوڑھے کی کمزوری آسے برداشت نہ ہوتی۔ ابھی آس کے آگے بڑھنے کے دن تھے۔ کھلا راستہ اور زندگی سے بھرپور نفع اندوز ہونے کا بے پایاں شوق وہ بوڑھوں پر ترس کھاتی تھی لیکن اس ترس میں نادانستہ سہی نفرت کی بھی آمیزش ہوتی۔ قاضی صاحب

تو اب بدل نہ سکتے تھے . جو ایک دن مضبوط ہاتھوں میں پہاڑی گھوڑے کی لگام کھینچے اور نیزہ تانے ہوئے بے تحاشہ جست و خیز میں نہایت مسرت پاتے تھے آج ان کا وہی تبدیل شدہ ناطاقت دل بے انتہا محبت کے ساتھ لطیفہ کو پیار کرنے کے لئے بے قرار ہو جایا کرتا ہے. وہ لطیفہ کے سر کے بال درست کر کے چوٹی گوندھ دینا چاہتے ہیں اور محبت سے آسے بلا رہے ہیں ــ آج ان کی آواز میں بلا کی شیرینی اور قیامت کی شفقت بھری ہوئی ہے مگر لطیفہ منہ گھما کے چلی جاتی ہے. قاضی صاحب کا دل زخمی ہوجاتا ہے اور وہ خاموش اکیلے بیٹھے رہ جاتے ہیں. ایک حالت میں بہت دیر تک بیٹھنا بھی تو مشکل ہے. لطیفہ کو دیکھنے اور اس سے اظہار شفقت کرنے کے لئے ان کا دل پھر سے بے قرار ہو جاتا ہے آس وقت لطیفہ بڑے کمرے میں سو رہی ہوتی ہے . قاضی صاحب آہستہ آہستہ وہاں جاتے ہیں اور بھر پور شفقت سے آس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں کبھی کبھی لطیفہ کی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور وہ ناراضی کے سروں میں چیختی ہے. " آپ یہاں کیا کرنے آئے ؟ آپ کی وجہ سے میں سو بھی نہیں سکتی ــ اب کبھی میرے قریب نہ آئیے گا . " لطیفہ قاضی صاحب کی کمزوریوں سے واقف ہے . وہ جانتی ہے کہ قاضی صاحب کو جتنا بھی زخم پہنچایا جائے وہ اف نہ کریں گے لطیفہ کے سنگدلانہ برتاؤ سے قاضی صاحب تلملا اٹھتے . مگر فوراً ہی کہتے ــ " نہیں نہیں ، تو سوجا . میں بس یوں ہی اک ذرا تجھے دیکھنے . . . نہیں، نہیں تو سو جا" انہیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ انہیں کیا کہنا چاہئے . باتیں بے ربط ہوجاتیں اور جلد جلد وہ چلے آتے . پہلے سے لاٹھی لے آنے کا خیال تو نہیں رہتا اس لئے کبھی کبھی دروازے سے ٹکرا کر سر میں زخم ہو جاتا . خون آمیز

آنسوؤں کی طرح لال لال خون بہہ پڑتا۔ ناقابل ضبط گریہ کو روکنے کی نا تمام کوشش میں وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگتے۔ مگر آنسو تو رکاوٹوں کی پروا نہیں کیا کرتے۔ بوڑھے کی تھر تھراتی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کا پردہ چھاجاتا جیسے کہرسے گھری ہوئی رات میں ٹمٹاتے دئے کی لو۔

لطیفہ سے قاضی صاحب ڈرتے ہیں۔ لطیفہ سے انہیں بے پناہ محبت ہے۔ ان کی شفقت انہیں اس بات پر ابھارتی ہے کہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح گود میں لے کر پیار کریں۔ جیسے وہ بچپن میں اس سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت لطیفہ کتنی بھولی بھالی تھی۔ کوئی سرخ چیز نظر آتے ہی وہ اسے شوق بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ اس کا بوٹا سا قد، اک ذرا چھوٹی سی ناک اور بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر قاضی صاحب کے دل میں ہلچل مچ جاتی ان کا دل چاہتا اسے سینے سے لگائے رہیں۔ لیکن سب کے سامنے وہ ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اس پر اپنے پیار کی بارش نہیں برسا سکتے تھے۔ پانچی کی ماں اسے دودھ کھلا کے دوسرے کاموں میں مشغول ہوجاتی اور اس وقت وہ ہرطرف بڑی محتاط نگاہیں ڈال کو لطیفہ کے پاس آتے اور دیکھتے رہتے مگر دیکھنے سے انہیں سیری نہ ہوتی۔ موم جیسی نرم، جاڑے کی دھوپ جیسی خوش آئند اور روشن لطیفہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر دیکھنے سے ایک خوش رنگ پرندے جیسے معلوم ہوتے۔ قاضی صاحب اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے کھیلتے، اسے نرمی کے ساتھ موڑتے۔ وہ کہتے، اس کا چہرہ اس کی ناک، اس کی آنکھیں بالکل اس کی ماں جیسی ہیں، مگر کتنی نرم، کتنی نازک۔ لطیفہ کے چہرے پر وہ نفرت کے نشانات بھی نہ تھے جو راحلہ کے چہرے پر تھے۔ راحلہ کے رخساروں پر

کس قدر نفرت آفریں اور دھاردار شکنیں نمودار ہوگئی تھیں۔ وہ باتیں جب یاد آتی ہیں تو اب بھی ان کا سارا جسم خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ قاضی صاحب کو دیکھتے ہی وہ چہرہ بھیانک اور بے رونق ہو جایا کرتا تھا۔ لال کنول جیسے حسین گالوں پر ناقابل برداشت نفرت کے سخت نشانات نمودار ہوتے۔ ایسے حسین چہرے پر اور ایسے ناقابل برداشت نفرت کے نشان!

اب قاضی صاحب ان باتوں کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ راحلہ کے چہرے کی یاد انہیں خوف زدہ کردیا کرتی ہے۔ انہیں محسوس ہوتا کہ گویا وہی کٹیھور چہرہ ہر ہر لمحہ انہیں بددعائیں دیتا رہتا ہے۔ وہ بد دعائیں ایسی خوفناک ہیں جن سے بچنے کے لئے کوئی توبہ اور کوئی معافی مفید نہیں۔ قاضی صاحب کا دل چاہتا ہے کہ وہ چیخ مار کر کہیں ــ اے اللہ، تونے مجھے پہلے ہی کیوں نہ لونجا بنا دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو میں نے یہ گناہ نہ کئے ہوتے۔ لطیفہ کے چہرے پر نظر ڈالنے سے قاضی صاحب کو محسوس ہوتا کہ راحلہ کے چہرے پر جو نفرت بھری شکنیں تھیں ان کے اثرات سے یہ محفوظ ہے۔ نہیں اس پر کہیں سے بھی دلخراش شکنیں نظر نہیں آتیں۔ آج بھی اس پھول جیسے حسین و نازک چہرے پر کوئی داغ نہیں پڑا۔ قاضی صاحب نے لطیفہ کے منہ کو پکڑ کے چوم لیا۔ لطیفہ جاگ اٹھی، اپنی بڑی بڑی دونوں آنکھوں کو مل کر ہنس دی اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دئے قاضی صاحب نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور سینے سے چمٹا لیا۔ لطیفہ کسی پرندے کے بچے کی طرح قاضی صاحب کے سینے سے چمٹی رہی۔ قاضی صاحب کے سینے میں آج ماں اور باپ کی مجموعی محبت موج زن ہے اور وہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ لطیفہ کے بیمار پڑنے سے ان کی

پریشانی بے حساب بڑھ جاتی . رات میں بار بار آٹھ کر وہ اسے دیکھنے جاتے . ممکن ہے پانچی کی ماں سو رہی ہو اور بچی چھٹ پٹ کرتی ہو ــ " اک ذرا پانی " . قاضی صاحب باہر سے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں مگر برداشت نہیں کر سکتے . وہ دوڑ کر ایک گلاس پانی لاتے ہیں اور وہ پی کر سو جاتی ہے . قاضی صاحب دبے پاؤں واپس آجاتے ہیں . دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ قاضی صاحب لطیفہ کو پانی پلا کے اور سلا کے جب چلے آتے تو پانچی کی ماں جاگ اٹھتی اور ناصاف الفاظ میں کچھ بڑ بڑا کر چپ ہو جاتی . قاضی صاحب لوٹتے لوٹتے سب کچھ سن لیتے . پانچی کی ماں کہتی ــ اس سے بڑی مرن اور کیا ہو سکتی ہے . جوانی میں بدمعاشیاں کیں اور اب بڑھاپے میں نیک بن گئے ہیں . بیہودہ بے حیا کہیں کا .

قاضی صاحب سب سمجھتے ہیں مگر سرجھکائے چلے جاتے ہیں . شرم سے ان کا جی چاہتا ہے زمین میں دھنس جائیں . لیکن لاجواب ہو کر وہ پانچی کی ماں کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے . سارا الزام وہ اپنے سر لے لیتے ہیں . نماز پڑھنے کے وقت کہتے ــ " اے اللہ ، لطیفہ کی ماں کو بخش دیجئے . اس کا کوئی قصور نہیں تھا .

دن اسی طرح گذرتے رہے . پانچی کی سخت باتیں سن کر بھی وہ کچھ نہ کہتے اور معمول کے مطابق لطیفہ کو دیکھنے آتے . محبت کے ساتھ لطیفہ کو بلاتے . اس کی کوئی تکلیف انہیں برداشت نہ ہوتی . ان کے کمزور سینے میں پرورش پانے والی ناطاقت شفقت خود اپنے آپ پرورش پاتی رہی . اسی حالت میں لطیفہ بڑھتی گئی ایسے ہی جیسے ایک بےہنگم بوڑھی چڑیا کی آغوش میں حسین و نازک

بچہ پروان چڑھتا ہے ۔ لطیفہ اب حسین امتزاج اور لطیف اعتدال کے ساتھ بڑی ہوگئی ہے۔ آس کے متناسب اعضا بالکل راحلہ جیسے ہیں مگر ان میں اب ایک درشت تیز مزاجی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ قاضی صاحب کی جوانی کا گرم گرم خون شوق اور جوش کے ساتھ بہت تیز تیز اس کی رگ رگ میں رواں دواں ہے ۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی ، اپنی مرضی کا کام کرتی ہے ۔ قاضی صاحب کے کچھ کہنے ہی سے وہ جھنجھلا اٹھتی ہے ۔

تھوڑے عرصے بعد کی باتیں ــ قاضی صاحب لطیفہ میں ایک تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔ دوسرے گھر کے فرید کے ساتھ لطیفہ کی رنگ رلیاں اب بے حیائی کی حدود پار کر چکی ہیں ۔ لطیفہ نے نفس پرستی اور جنسی بے راہ روی ورثہ میں پائی ہے ۔ اس خون کے ہر ہر قطرے میں قاضی صاحب کی نوجوانی کا رنگ روپ اور آس دور کی عیش کوشیوں کا ترکہ جی اٹھا ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی قاضی صاحب کو کچھ بولنے کا یارا نہیں ہے ۔ کہنے کا کوئی حق انھوں نے باقی بھی نہیں رکھا اور اسی لئے نہ وہ کوئی روک تھام کر سکتے اور نہ احتجاج ۔ کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں تو ان کا گلا رندھ جاتا ہے۔ تاہم ان کی نظروں کے سامنے ہر روز ایسے مناظر آنے لگے اور شہوانی بے راہ روی نے یہ کیفیت اختیار کرلی کہ وہ خاموش نہ رہ سکے ۔ انھوں نے لطیفہ کو سخت بندشوں میں ڈال دیا۔ یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ سرتاپا معصیت آلود ہوتے ہوئے بھی اپنے محبوب اعزہ کے لئے پاکبازانہ اور نکوکارانہ زندگی کی تمنائیں کرتا ہے ۔

اسی طرح چند مہینے گذر گئے اور قاضی صاحب جلد سے جلد لطیفہ کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ دینے کی کوشش کرنے

لگے . لیکن ایسی لڑکیوں کی شادی بھی تو آسان نہیں . قاضی صاحب کی انتہائی دوراندیشی اور احتیاط کی وجہ سے لطیفہ اگرچہ اپنی پیدائش کے حادثات سے باخبر نہ تھی لیکن دوسرے لوگ اس سے بے خبر نہ تھے . ادھر غیر معمولی فکروں کے بار نے قاضی صاحب کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ گرنے لگے .

آس روز تمام رات بیماری کی کشمکش کرنے کے بعد قاضی صاحب اک ذرا سرنے ہی تھے کہ پانچی کی ماں کے شور و غل اور چیخ و پکار سے ان کی آنکھیں کھل گئیں. پانچی کی ماں بری طرح ہانپتے کانپتے بولی کہ لطیفہ گھر سے غائب ہے. صبح دیر تک لطیفہ کے گھر کا دروازہ بند دیکھ کر وہ اس کی خبر لینے جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں لطیفہ کا کوئی پتہ نہ تھا. آس پاس تلاش کی گئی مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا .

قاضی صاحب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے ــ لطیفہ چلی گئی؟ کہاں گئی ؟ کیوں چلی گئی ؟ قاضی صاحب کو ان سوالوں کا جواب نہ ملتا تھا وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر گئے .

اس کی زیادہ تلاش بھی نہیں کی گئی . دوسرے گھر سے بھی خبر آئی کہ فرید صبح ہی سے لاپتہ تھا. وہ دو سطروں کا ایک خط چھوڑ گیا " ہم لوگوں کی تلاش عبث ہے اگر ہم تلاش سے مل بھی جائیں تو واپس نہ آئیں گے . قانوناً ہم دونوں بالغ ہیں اس لئے ہمارے بارے میں آپ لوگوں کو دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہے . فقط ــ فرید "

قاضی صاحب پورا خط نہ پڑھ سکے. ان کے پیروں کے نیچے گھر، زمین سب ہلتی معلوم ہونے لگی. ایک زلزلہ ، سخت زلزلہ چاروں طرف سخت اندھیرا . افسوس اس قدر نا امیدیوں سے بھرا

ہوا احساس نامرادی ۔ بوڑھے قاضی صاحب پھر کچھ دنوں کے لئے بستر علالت کے مہمان ہو گئے ۔

آہستہ آہستہ قاضی صاحب پھر کچھ بہتر ہو گئے ۔ مگر ان کے خیالات کی پرا گندگی نہ گئی ۔ کوئی بات وہ اچھی طرح سے سمجھنے سے بھی قاصر تھے ۔ ایک پالتو جانور جیسا نقشہ ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے پر نمایاں تھا ۔ اب ان میں رونے کی بھی سکت نہ تھی ۔ پھر بھی کبھی کبھی ان کے دل کی عجیب حالت ہوجاتی ــ وہ لطیفہ کو قریب دیکھنا چاہتا ہے ۔

کسی کسی تاریک رات میں ان کی نیند ٹوٹ جاتی ۔ آس پاس کوئی آواز نہیں ۔ مکمل سکوت ایک نورانی شعاع اپنے اندر لئے مشتعل ہے ۔ ایک ناقابل انداز نورانیت ۔ یہ سکوت ایک خاموش درد کی طرح ان کے سارے جسم کو جکڑ لیتا ، ایسا کہ انہیں سانس لینا بھی دشوار معلوم ہوتا ۔ ایسا محسوس ہوتا کہ گھر میں لوگ گھوم پھر رہے ہیں ۔ صوفیہ ، راحلہ اور نہ جانے کون کون ۔ نگاہوں کے سامنے راحلہ کی غیر فطری موت کی وجہ سے بہت لمبی صورت ، اس کا بھیانک چہرہ ، اس کی نفرت بھری نگاہیں ۔ خوف سے قاضی صاحب بیدم ہو جاتے ہیں ۔ اب گھر میں رہنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا اور وہ کانپتے کانپتے باہر چلے جاتے

ایسی ہی ایک جاڑے کی رات میں جبکہ دنیا ایک گہری سستی اور نیند میں ماتی ہوئی تھی قاضی صاحب ندی کے کنارے گھوم رہے تھے ۔ ان کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ رہا تھا ۔ پیشانی پر پسینے کی بوند اور سارا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے ۔ آہستہ آہستہ وہ پکڑ کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے ۔ جاڑے کے مارے ہوئے پکڑ کے درخت میں ایک پتہ بھی نہ تھا ۔ بس ایک

کنگال کی طرح اس کا برہنہ عظیم جسم اپنی جگہ کھڑا تھا۔

قاضی صاحب لطیفہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں چلی گئی؟ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا وہ ایک مرتبہ بھی باپ کو یاد نہیں کرتی؟ کیا اسے وہ دن بالکل یاد نہیں جب وہ ایک موم کی حسین مورتی کی طرح بستر پر سوئی رہتی اور بے کل باپ اس کے سرہانے کھڑا رہا کرتا تھا؟

لطیفہ کو گئے ایک سال گذر چکا ہے۔ اس ایک سال کے اندر ہی قاضی صاحب گویا بیس سال آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کے جسم اور دل میں ہمت کی رمق بھی باقی نہیں ہے۔ معمولی سی جائداد نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے اب نیلام ہونے لگی ہے۔ کہیں کہیں زمینیں دوسروں نے دبالی ہیں۔ مگر ان سب کی طرف دیکھنے کی طاقت اب قاضی صاحب میں نہیں ہے۔ گھر کے نوکر چاکر، یار آشنا عزیز و اقارب سب نے تعلق ہوچکے ہیں۔ اب گھر میں وہ اکیلے ہی رہتے ہیں۔ پانچی کی ماں آکے ان کا کھانا پکا جاتی ہے۔ مغربی کمرے کے قریب ہی ان کی جوانی کا رفیق گھوڑا سویا رہتا ہے۔ اب اس کا سائیس بھی چلا گیا ہے۔ اصطبل شکستہ ہو رہا ہے۔ قاضی صاحب خود ہی اس کے چارے کا بندوبست کرتے ہیں اور حتی الامکان دیکھتے بھالتے ہیں۔

ندی کے کنارے بناسپتی کے عظیم درخت کے سائے میں جڑوں پر بیٹھے چند بوڑھے اپنی زندگی کے سکھ دکھ کی داستان دہرا رہے ہیں۔ ان بوڑھوں میں سے ایک نے کہا — قاضی صاحب اب غالباً نہ بچیں گے۔ بیماری بہت بڑھ گئی ہے۔ آف، ایسا نوجوان، ایسا شوقین اور ایسا بانکا ہمارے دور میں اور کوئی نہ تھا۔ آج ان کے منہ میں کوئی پانی ٹپکانے والا بھی نہیں ہے۔

پیر علی نے ایک گوشے سے کہا — نہیں، بچنے کی اب کوئی آس نہیں۔ اس روز دیکھنے گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہچان بھی نہ سکے۔ بہت دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد پہچان سکے۔ سچ مچ بیچارے کا حال دیکھ کر رونا آتا ہے۔

پیر علی افسوس سے کہتے ہیں — قاضی صاحب کی زمین اور جائداد سب برباد ہوتی جارہی ہے۔ اب ان میں اچھی فصل نہیں ہوتی۔ ندی کی دوسری جانب انگلی سے اشارہ کرکے وہ بولے — آج وہ زمین بنجر پڑی ہے مگر ایک زمانے میں اس سے بہتر فصل اس جوار میں کہیں نہیں ہوتی تھی۔

سب کی نگاہیں ندی کے پار والے بنجر میدان کی طرف اٹھ گئیں۔ اس بنجر زمین پر کبھی کروئی کے پھول اگتے اور غلے کی افراط سے لوگوں کی رشک آلود نظریں پڑتیں آج اس کے ماضی پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

کچھ دنوں تک بیمار رہنے کے بعد قاضی صاحب آج پھر اٹھنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ لیٹے لیٹے وہ دیکھ رہے تھے کہ گھوڑا زمین پر پڑا بڑی حسرت بھری نظروں سے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید کچھ دنوں سے اسے مناسب غذا نہیں ملی۔ قاضی صاحب کسی طرح گرتے پڑتے گھوڑے کے قریب آکر کھڑے ہوئے۔ گھوڑے نے بھی یکایک کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کے زمین پر گر گیا۔ قاضی صاحب نے کسی طرح کچھ چارا گھوڑے کے سامنے لا رکھا مگر اس نے کچھ نہ کھایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس وہ قاضی صاحب کے قرب سے مطمئن ہے۔ قاضی صاحب نے گھوڑے کو آہستہ تھپتھپایا اور اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے اور اس نے بھی اپنا سر ان کی گود

میں رکھ دیا ۔ دو مختلف النوع جاندار کی محبت بھری نزدیکی دنیا کی لذتوں سے محرومی پر ہمدردانہ جذبات کی حامل بن گئی ۔

قاضی صاحب آج بہت رات گئے تک گھوڑے ہی کے پاس بیٹھے رہے ۔ پانچی کی ماں ایک بار پھر انہیں یاد دھانی کرانے آ گئی تھی — اندر جائیے ، سردی لگ جائے گی۔ قاضی صاحب ایک بے سہارے ساتھی کی طرح اک ذرا اور بھی گھوڑے کے قریب کھسک گئے ۔ ایک بچے کی طرح خوشامد کرتے ہوئے انہوں نے کہا — پانچی کی ماں، اک ذرا اور بیٹھنے دو ۔ پھر میں آتھ جاؤں گا ۔ قاضی صاحب کی آواز پانچی کی ماں کے دل میں بھی ترس پیدا کرتی ہوئی اترتی چلی گئی اور اس منظر پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں ۔ آنسو پونچھنے کے لئے وہ اک طرف کھسک گئی ۔ اُف پہاڑ جیسا وہ جوان اور اس کا یہ حال ! — اس کا دل اندر سے رونے لگا اور ناقابل بیان درد سے اس کی چھاتی پھٹنے لگی۔

کئی بار کھانسی کی آواز سن کر پانچی کی ماں باہر نکلی ۔ قاضی صاحب اندھیرے میں گھوڑے کے سینے پر سر رکھے سو رہے ہیں ۔ پانچی کی ماں نے انہیں جگادیا اور وہ کھانستے کھانستے گھر میں جاکر سو رہے ۔

” پانچی کی ماں آج پھر ویسا ہی درد شروع ہوگیا ہے “ ۔ قاضی صاحب نے بڑی تکلیف کے ساتھ سانس لیتے ہوئے کہا پانچی کی ماں چونک پڑی۔ چند دنوں پہلے بھی وہ سینے میں سردی لگنے کی وجہ سے مرتے مرتے بچے تھے ۔ اب پھر وہ ٹھنڈ لگنے کے

بعد جو مصیبت آنے گی وہ کس منزل تک لے جائے گی اسے وہ خوب سمجھتی تھی ۔

اس دن آخری رات کا چاند آسمان پر آخری جھلک دکھا رہا تھا ۔ جس وقت وہ آنے والی صبح کے منھ سے منھ ملا رہا تھا ۔ اسی وقت قاضی صاحب کے منھ سے خون کی دھاریں پھوٹنے لگیں ۔ بڑے بڑے جمے ہوئے ٹکڑے ۔ سرخ چمکدار تازہ خون ۔ ایسا کہ ہاتھ میں اٹھا کے دیکھنے کو جی چاہے ۔ جوانی میں یہی خون ناقابل تسخیر طاقت کا خزانہ تھا ۔ وہی خون بہت دنوں تک بے جان رہ کر آج پھر نمودار ہوا ہے ۔ دن ختم ہونے وقت سارا آسمان خونیں رنگ کی چادر اوڑھ کر اپنی عمر کے خاتمہ کا اعلان کر رہا تھا اور اپنی آخری رنگت دکھانے میں کوئی بخل نہیں کر رہا تھا ۔

ناقابل برداشت درد میں قاضی صاحب کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی ۔ بس پھٹی پھٹی آنکھیں تھیں جو چاروں طرف بلا قصد نگراں تھیں ۔ پانچی کی ماں بے چینی کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی اس نے کان کے قریب منھ لے جا کے پوچھا کسی کو بلاؤں ؟ قاضی صاحب کوئی جواب نہ دے سکے ۔ ان کی دونوں آنکھوں سے دو دھار آنسو کے بہ نکلے ۔ آہستہ آہستہ ان کی سانس بند ہونے لگی ۔ سارے جسم کی حرارت اور طاقت پر جن اعضا کی حرکت کا دار و مدار تھا وہ اب ناطاقت ہونے لگے ۔ آخری سانس لینے سے پہلے انہوں نے کسی طرح بچی کچھی طاقت جمع کر کے کہا ــ " لطیفہ ؟ لطیفہ نہیں آئی ۔ اس کے آنے کی اب ضرورت بھی نہیں " ۔ صبح کے قریب قاضی صاحب ہمیشہ کی نیند سو گئے ۔

بے برگ و بار بناسپتی کے نیچے آج پور بوڑھوں کا جماؤ ہے مگر آج ان کی جماعت چھوٹی ہو گئی ہے ۔ ایک ممبر کم ہوگیا ہے۔ اب نئے بوڑھے اس جماعت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ندی کے پار وہی کھیت بالکل فصلوں سے محروم ہوکر ایک بنجر اوسر کا نمونہ پیش کر رہے ہیں ۔ اب شاید وہاں کبھی کوئی فصل پیدا نہیں ہوگی ۔ زمین وہاں مردہ ہے ۔ طاقت نمو ختم ہو چکی ہے ۔

سید ولی اللہ

جزیرہ سندیپ جوفی الحال ضلع چاٹگام کا ایک جزیرہ ہے اس میں ۱۹۱۸ ء سید ولی اللہ کی پیدائیش ہوئی- ڈھاکہ یونیوسٹی سے انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا- تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں تک کلکتہ کے مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کے دفتر میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے- موجودہ وقت میں سید ولی اللہ حکومت پاکستان کے دفتر خارجہ میں ممتاز عہدے پر مامور ہیں- ان کی تصنیفات اگرچہ ماضی قریب میں سامنے نہیں آسکی ہیں لیکن ابتدائی دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس نے انہیں ادیبوں کی محفل میں ایک ممتاز مقام کا مالک بنادیا ہے - تقسیم ملک سے پہلے مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے افسانوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی- ان کا مشہور ناول ،،لال شالو،، بھی محفل ادب میں بہت زیادہ تحسین و آفرین حاصل کر چکا ہے .

(ایک ڈی تلسی گا چھیر کاھنی)

تلسی کے ایک درخت کا افسانہ

سید ولی اللہ

دھنک حسب خمیدہ ، سیمنٹ کی اینٹ جیسا چوڑا پل سے ایک سو گز کے فاصلے پر وہ گھر ہے . دو منزلہ، راستے سے سیدھا بلند ہوگیا ہے. اس علاقے میں فٹ پاتھ نہیں ہے اور اسی لئے اس گھر کے باہر زمین کا کوئی حصہ چھوڑا نہیں گیا ہے . ہاں گھر کے پیچھے کافی جگہ پڑی ہوئی ہے . غسل خانہ ، باورچی خانہ ، بیت الخلا اور ان کے درمیان کشادہ صاف ستھری جگہ کے علاوہ بھی اور کافی جگہ موجود ہے . جس میں آم ، جامن اور کٹھل وغیرہ کے جنگل لگے ہیں . گھنی گھاس اور مرطوب زمین کی وجہ سے نم نم سی بو بھی ہر طرف پھیل رہی ہے . یہاں دن کو بھی شام جیسی تاریکی چھائی رہتی ہے .

اتنی جگہ کے ہوتے سامنے کی طرف ایک ذرا باغیچہ کے لئے جگہ چھوڑ کر گھر بنانے میں آخر کیا حرج تھا؟ ان کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا ہے . متین کا خیال ہے کہ باغیچہ نہ سہی اگر اک ذرا جگہ ہی چھٹی ہوئی ہوتی تو وہ خود چند پودے لگا کے باغ بنا لیتا . وہ بڑی احتیاط سے موسمی پھول کے پودے لگاتا ،

گندھراج سے کیاریاں سجاتا ، بکول ، حسن حنا اور دو چار گلاب کے درخت لگاتا ۔ پھر شام کے وقت وہ آفس سے واپسی پر وہاں پر بیٹھتا ۔ بیٹھنے کے لئے ایک ہلکی بیت کی کرسی یا کینویس کی آرام کرسی خرید لیتا اور بیٹھ کے تفریحی باتوں میں وقت گذارتا ۔ امجد کی حقہ پینے کی عادت ہے ۔ وہ باغ کی عزت برقرار رکھنے کے لئے ذرا اک خوبصورت سی گڑ گڑی خرید لیتا اور شام کو آرام سے پیتا اور لطف اندوز ہوتا ۔ قادر بھی قصوں کا رسیا تھا ۔ اک ذرا کھلی ہوا میں اس کا گلا قصوں سے بھر جاتا اور پھر حسن حنا کی لپٹوں میں وہ کس قدر محفوظ ہوتے ۔ اور پھر چاندنی راتوں میں قصے کہانی کے بغیر بھی تو خاموش سکون سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے ۔ کیا چاند سا مکھڑا سامنے رکھ کر خاموشی سے بھی آسودہ نہیں ہواجاسکتا ؟ دفتر سے تھک تھکا کے پھرنے پر دو منزلے کی سیڑھیوں پر چڑھتے وقت یہ باتیں برابر ان کے دل میں آیا کرتی تھیں ۔

انھوں نے مکان پر قبضہ کرلیا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ قبضہ کرنے میں انھیں لڑنا جھگڑنا نہیں پڑا ۔ یہ بھی نہیں کہ ان کی جسمانی قوت دیکھ کر لوگوں نے ہار مان لی ہو ۔ تقسیم ملک کے ہنگامے میں یہ لوگ اس شہر میں نووارد کی حیثیت سے آئے اور نا امیدیوں کے ساتھ کسی جائے پناہ کی تلاش میں پھرتے رہے ۔ ایک دن انہوں نے اس مکان کو دیکھا ــ مکان ایک عظیم الشان مکان جو جانداروں سے بالکل خالی سائیں سائیں کررہا تھا ۔ شروع شروع میں تو انہیں کچھ خوف بھی ہوا مگر پھر ساتھی سنگھی کے زور پر تالا توڑ کر اس مکان پر قابض ہوگئے تھے ۔ یہ لوگ بیساکھ کے مہینے میں آم توڑنے اور کھانے کے فوری نشے میں

ایسے ازخود رفتہ ہوئے کہ انہوں نے کو اس معاملے کو دن دوپہر کی ڈکیتی سمجھا ہی نہیں۔ اگر کسی وقت خلاف آئین یا غلط کام کرنے کا خیال بھی پیدا ہوتا تو تیز قہقہوں والی ہنسی کے طوفان میں اس کا بوجھ ہلکا ہوجاتا۔

شام کے قریب جب شہر میں ان خوش نصیبوں کی کامیابی کی اطلاع پھیل گئی اس وقت محروم رہنے والوں کی آمد شروع ہوئی۔ ایک چھت کے نیچے قیام کی جگہ پانے کی آس میں ان کی جماعتیں یکے بعد دیگرے آنے لگیں مگر ان قابضوں نے انہیں گھسنے نہ دیا ــ "کیا ڈکیتی کا ارادہ ہے؟" انہوں ٹھنڈے مزاج سے کہا۔ ــ جگہ کہاں؟ سارا گھر تو بھر گیا ہے۔ دیکھئے اس چھوٹے اندھیرے کمرے میں بھی چار بستر لگے ہیں۔ ابھی تو بستر ہیں، پھر چھ بائی تین فیٹ کی چوکیاں بھریں گی۔ چھ ہی کرسیاں اور میز ہیں آنے پر گھر میں کوئی رہ سکے گا؟" دوسرے نے ہمدردانہ طور پر کہا ــ ہمیں تکلیفوں کا احساس ہے۔ ہم نے بھی یہ چند روز بڑی تکلیفوں میں گذارے ہیں آپ کی قسمت ہی خراب ہے چار کیا بس صرف دو گھنٹے پہلی ہی اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کے کے ایک موٹے آدمی نے آکر وہ نیچے کی منزل کے کونے والے کمرے پر قبضہ کیا ہے۔ اگرچہ وہ کمرہ راستے کے اوپر ہے پھر بھی برا کیا ہے۔ جنگلے سے ملی ہوئی سرکاری راستے کی روشنی ہے۔ اگر کبھی گھر کی بتی بجھ بھی جائے تو کمرہ اندھیرا نہیں رہے گا اور مزے میں رات گذر جائے گی۔

سارے ملک میں شدید بحرانی کیفیت تو ضرور پیدا ہوگئی ہے لیکن پھر بھی کسی حصے میں مگوں یا لٹیروں کی حکومت نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس غیر قانونی کام کا تدارک کرنے کے لئے بعد

میں پولیس بھی آئی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ مفرور مالکان مکان نے بازیابی کے لئے حکومت کے سامنے کوئی عرضداشت پیش کی تھی اور اسی وجہ سے پولیس آئی تھی۔ بلکہ درخواست دینے پر تو کام کی توقع کم تھی۔ جو لوگ جان کے خوف اتنے سے بڑے گھرانے کو صرف دو دنوں کے اندر اندر دیس سے غائب کرسکتے ہیں ان کے متعلق ایسا سوچنا زیادتی ہوگی۔ پولیس تک انہیں لوگوں نے یہ خبر پہنچائی تھی جو شہر کے دوسرے حصوں میں کسی مکان پر غاصبانہ قبضے کی فکر میں پھرتے رہے تھے اور چار گھنٹے یا دو گھنٹے پہلے آکر خوش نصیبوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھا سکے تھے۔ یہ تو بس قسمت کی بات تھی۔ مگر ان کا یہ قول ہے کہ ہم بد نصیب ہو سکتے ہیں تو یہ قبضہ کرلینے والے کیوں خوش نصیب بنیں گے۔ اپنی خوش قسمتی کی بقا کے لئے بے ضرر لوگ بھی ضرورت سے مجبور ہو کر لٹھ بازی پر اتر آیا کرتے ہیں۔ واقعی طور پر اگر چہ لٹھ بازی نہیں ہوئی مگر ان لوگوں نے پولیس کے لوگوں سے سب باتیں کچھ اس طرح سمجھادیں کہ سب انسپکٹر نے دوبارہ کچھ پوچھے بغیر انہیں حق بجانب کہہ کے واپسی کی راہ لی۔ اسے اوپر رپورٹ تو دینی ہی تھی اس لئے اس نے تو کچھ اس طرح کی پیچیدہ رپورٹ دی کہ اوپر والوں کو بھی بلا کچھ کہے اسے داخل دفتر ہی کر دینا پڑا۔ اور پھر اس میں عجلت کی ضرورت ہی کیا ہے جو لوگ مفرور ہو گئے ہیں ان کے ساتھ اتنی ہمدردی کی کیا ضرورت ہے۔ جب تک مالکان مکان خود آکر کچھ نہ کہیں ان کے معاملے میں اسی قدر درد سر پیدا کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ مزید برآں یہ لوگ کلرک ہوتے ہوئے بھی آخر شریف لوگوں کی اولاد ہیں۔ ان کے قابض رہنے سے کم از کم یہ

تو یقیں ہے کہ دروازہ جنگلا محفوظ رہے گا. یہ خود تو اسے توڑکو خورد برد کرتے نہیں ہیں . اس لئے اس معاملے میں درد سری کی ضرورت نہیں ہے .

یہ گھر راتوں رات ٹھیک ٹھاک ہو گیا . یہ لوگ کلکتہ کے باشندے تھے . اور بلیک مین لین ، خلاصی پٹی ، بیٹھک خانہ دفتری پٹی ، سید صالح لین یا تمباکو کے کاروباریوں کے ساتھ یا چمرو خالسامان لین وغیرہ میں بدبو دار علاقوں میں رہ کر آئے تھے. اس گھر کے کمرے وسیع اور نیلی کوٹھی کی وضع کے بڑے بڑے جنگلے اس کی دیواروں میں لگے ہوئے تھے . پشت کی جانب وسیع صحن اور اس کی پشت پر آم ، جامن اور کٹھل کے جنگل بنے ہوئے باغ موجود تھے۔ پھر نہ پوچھئے کہ ان لوگوں کو اس مکان میں کس درجہ لطف حاصل ہوا۔ یہ ٹھیک بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے لاٹ صاحبی کرکے ایک ایک کمرے پر قبضہ نہیں کیا تھا تاہم کشادہ کمروں میں بلاتعرض پاک و صاف ہوا کی آمد اور روشنی کی بہتات نے انہیں بے حد مسرور بنایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اب زندگی عیش و آرام سے بسر ہوگی اور اس گھر کی روشنی اور ہوا سے جو خون پیدا ہوگا وہ جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑائے گا۔ ہزاروں کمانے والوں کی طرح منھہ کی رونق بھی بڑھے گی اور جسم ملیریا اور کالا آزار وغیرہ کے جراثیم سے نجات پاجائے گا۔

یونس میکلاوڈ اسٹریٹ میں رہتا تھا . اس راستے کا نام تو صاحبانہ طرز کا تھا ضرور مگر اس کے ہر ہر گوشے میں غلاظت اور گندگی بھری ہوئی تھی . ڈسٹ بن جو صبح کو گھر کی غلاظتوں سے بھرتا تو شام تک بھرا ہی رہتا تھا . اسی گلی میں

ایک نیم شکستہ لکڑی کے دو منزلے پر ایک دیسی چمڑے کے تاجر کے ساتھ یہ دن گذارتا تھا۔ کبھی کسی نے کہا تھا کہ چمڑے کی بدبو بہت مفید صحت ہے۔ اس سے دق اور سل کے جراثیم مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس چمڑے کی بو تو متعفن سڑی ہوئی نالیوں کی بد بو پر بھی غالب آجاتی تھی۔ اگر گھر کے کسی گوشے میں چوہا یا بلی مر کے گل سڑ جاتی تب بھی اس بو کے سامنے اس کی بد بو کا پتہ نہ چل سکتا۔ یونس نے سوچا برا کیا ہے۔ کم سے کم اتنا تو ہے کہ سل اور دق کے جراثیم تو پیدا نہیں ہوں گے۔ اس کا جسم بہت کمزور سا ہے۔ دبلا پتلا۔ یہاں دوسری منزل پر دکھن جانب کے کمرے میں جنگلے کے قریب لیٹ کر دھوپ کی سنہری کرنیں دیکھ کے اسے میکلاڈ اسٹریٹ کا گھر یاد آتا اور اس کا بند بند کانپ جاتا۔ وہ سوچتا ۔ اتنے دنوں میں نہ جانے کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔ بہتر ہوگا کہ ڈھاکہ کے کسی ڈاکٹر کو سینہ دکھا لیا جائے۔ احتیاط اسی میں ہے اور پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

اندر باورچی خانہ کے بائیں جانب آدھ ہاتھ بلند ایک چوکور تھالے میں تلسی کا ایک درخت ہے۔ ایک دن صبح کے وقت نیم کی ایک شاخ لئے مسواک کرتے کرتے مدبر صحن میں ٹہل رہا تھا کہ اس کی نظر تلسی کے درخت پر پڑ گئی۔ مدبر بڑا ہی جذباتی آدمی ہے۔ اک ذرا کوئی بات ہوتے ہی وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اس کی چیخ پکار سن کے سب ہی نیچے آ گئے۔ اس کی آواز پر اتنا تو سبھی کو شک ہوا کہ چاہے کوئی بڑی اہم بات نہ ہو مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہے۔

یہی تلسی کا درخت۔ اسے اکھاڑ پھینکنا ہو گا۔ اب جبکہ

ہم لوگ اس گھر میں آ گئے ہیں تو اس میں کوئی ہندوانہ نشان نہ رہنا چاہئے۔

سب ہی نے اس کی طرف دیکھا۔ کتھئی رنگ کے درخت میں گہرے سبز رنگ کے پتے کچھ مرجھائے ہوئے لگے ہیں۔ نیچے کئی دن کی بے توجہی کی وجہ سے گھاس بڑھ آئی ہے۔ تعجب ہے کہ اتنے دنوں تک اس پر نظر ہی نہ پڑی۔ جیسے کہیں چھپا ہوا تھا۔

وہ سب یک بیک حیران اور پریشان ہو گئے۔ انہیں جو مکان اس قدر خالی خولی معلوم ہو رہا تھا اس میں سیڑھی کے گھر کی دیوار پر نو مشق ہاتھ کا لکھا ہوا نام ہوتے ہوئے یہ بھی بالکل ایسا ہی لاوارث معلوم ہوتا تھا کہ اس کی صورت ہی بدل گئی۔ یہ تلسی کا درخت، ایک حیرت خیز منظر، اسے دیکھتے ہی سب باتیں ذہن میں آ گئیں۔

ان کی خاموش حیرانی دیکھ کر مدیر نے پھر زور سے کہا — کیا سوچ رہے ہو؟ کوئی بات نہیں۔ اسے اکھاڑ ہی پھینکو۔

ہندؤں کے رسم و رواج کو یہ اچھی طرح نہیں جانتے۔ انہوں نے کہیں سے سن پایا تھا کہ ہندؤں کے گھر میں ہر روز شام کو گھر کی مالکہ تلسی کے درخت کے نیچے شام کا چراغ جلایا کرتی ہے اور سر آنچل ڈال کے اسے پرنام کرتی ہے۔ گھاس بڑھ جانے کے باوجود یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس درخت کے نیچے بھی کوئی ہر شام چراغ جلاتا اور پرنام کیا کرتا تھا۔ آسمان پر جب شام کا تارا اپنی طاقتور شعاعیں دکھا کر اپنے وجود کا یقین دلاتا ٹھیک اسی وقت گھنے سائے کے نیچے سیندور کی خونیں آمیزش سے ایک خاموش چراغ ہر روز سکھ شانتی کی آشا لئے جلا کرتا۔ ممکن

ہے مدتوں اور برسہابرس تک وہ اسی طرح جلتا رہا ہو۔ گھر پر بد اقبالی نے سایہ ڈالا ہے اور ممکن ہے کسی کی زندگی کا چراغ بھی بجھ گیا ہو۔ مگر اس درخت کے سائے تلے والا چراغ اپنی لو سے ضیا پاشیاں کرتا ہی رہا۔

گھر کی جس مالکہ نے سال کے بعد سال اور دن کے بعد دن اس تلسی کے درخت کے نیچے چراغ جلایا وہ نہ جانے آج کہاں ہے؟ اس گھر سے کیوں رخصت ہو گئی؟ معین ایک زمانے میں ریلوے میں ملازم تھا۔ وہ سوچتا — ممکن ہے وہ کلکتہ گئی ہو، یا آسنسول، ورنہ ہوڑا کے کسی رشتہ دار کے گھر۔ للوا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہاں عظیم نے ریلوے یارڈ کے نزدیک ایک پرانے سیاہ دو منزلہ مکان کے برآمدے پر چوڑے لال پاڑھ کی ایک ساڑی تو سوکھتے دیکھی تھی۔ ممکن ہے وہ اس گھر کی مالکہ ہی رہی ہو۔ کہیں بھی ہو مگر جب دن کے خاتمے پر تاروں کی چھاؤں سر پر سایہ افگن ہوتی ہوگی اس وقت اس تلسی کے درخت اور آس کے نیچے جلنے والے دئے کی یاد آس کی آنسوؤں بھری آنکھوں میں ضرور ہی آتی ہوگی۔

گذشتہ کل سے یونس کو زکام ہوا ہے۔ یہ بات . . . . اچھا رہے نا، ہم لوگ تو اس کی پوجا کرنے نہیں جاتے بلکہ گھر میں ایک تلسی کے درخت کا رہنا اچھا ہی ہے۔ زکام میں اس کے پتوں کا رس مفید بھی ہے۔

مدبر نے ادھر دیکھا غالباً سب کی یہی رائے تھی۔ ان سب میں عنایت ایک ذرا مذہبی قسم کا آدمی ہے: چہرے پر داڑھی ہے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے اور صبح کو قرآن پاک تلاوت بھی کرتا ہے۔ وہ اب تک خاموش تھا۔ ہر روز شام کو آس گھر

کی مالکہ کی نمناک آنکھوں کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے بھی پھرنے لگا۔ تلسی کا درخت خاموش براجمان رہا۔ کلکتہ میں ہر وقت اونگھ لانے والی آب و ہوا سے نجات حاصل ہوچکی ہے۔ اور اب وہ اچھی آب و ہوا میں آچکے ہیں۔ یہاں جمگھٹا بھی اچھا ہوتا ہے۔ آپس میں تو تو میں میں بھی ہوتی ہے۔ منھ میں کف اور پھر بحث مباحثہ۔ سماجی، سیاسی اور اقتصادی ہر طرح کے مباحثے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح قومی اور مذہبی باتیں بھی کبھی کبھی ہوا کرتی ہیں۔

— وہی تو سب کی مجموعی طاقت کی وجہ سے اصل بات ہے ہندؤں کی پست ذہنیت اور ضد کی وجہ سے ملک تقسیم ہوا

پھر وہ ان کے مظالم، بے انصافیوں اور تنگ نظریوں کی بے شمار مثالیں پیش کرتے۔ اس طرح سب کے خون میں گرمی آجاتی۔ اس جماعت میں بائیں بازو کے ایک سرگرم حامی مقصود میاں بھی ہیں۔ وہ کبھی کبھی مدافعانہ کلمات بھی کہتے ہیں— اس حد تک نہیں ہے۔ اچھا اگر ہے بھی تو ہماری طرف سے کیا کمی ہوئی ہے۔ مدبر دانت پیسنے لگتا ہے۔ ہاں بائیں بازو والے کے جسم میں تو خوامخواہ کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اپنا ہی قصور نظر آتا ہے۔ ہم حلف سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کا قصور ہے۔ وہ سالے بھی اسی طرح کا حلف اٹھا سکتے ہیں کہ ہمارا ہی قصور ہے۔ معاملہ ہی پیچیدہ ہے جسے سمجھنا بھی مشکل ہے۔ بائیں بازو والوں کا حال تو اور بھی افسوسناک ہے۔ وہ کبھی یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے ہم ہی صحیح راہ پر ہوں۔ پھر شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ کانٹا ان کے بازو میں چبھا رہتا ہے۔ کبھی داہنے بازو

میں اور پھر کبھی بائیں بازو میں یہاں تک کہ وہ بائیں بازو میں چبھ کر ناپید ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو ان کو بائیں بازو والا کہا جاتا ہے۔

پائخانہ جاتے وقت باورچی خانہ کے بائیں جانب یہ تلسی کا درخت نظر آیا کرتا ہے۔ کسی نے اس کی گھاس وغیرہ کاٹ کر صاف کردیا ہے۔ اس کے پتے سوکھ کر کتھئی رنگ کے ہوگئے تھے مگر پھر وہ اپنی اصلی رنگت پاگئے اور لہلا اٹھے۔ ان کی جڑوں میں کسی نے پانی بھی ڈالا ہے مگر پانی ڈالنے والے کا پتہ نہیں چلتا۔ آخر آنکھوں کی شرم بھی تو کوئی چیز ہے؟

یونس نے سوچا تھا کہ میکلاؤڈ اسٹریٹ میں چمڑے کے گندے دوکانداروں کے محلے میں اب پھر جانا نصیب نہ ہوگا۔ یہاں روشنی اور ہوا نے اسے کچھ دنوں کے لئے تازہ ہوا بخشی تھی۔ مگر اس کا یہ خیال غلط تھا۔ صرف یونس ہی کیوں، ہر ایک نے یہی سوچا تھا کہ اس گرانی کے زمانے میں چاہے عمدہ کھانا نہ نصیب ہو، خواہ گھر وہ روپیہ نہ بھیج سکیں مگر ہوا اور روشنی کی غذا سے تو محروم نہ رہیں گے اور یہ مکان ہی ایک نعمت ثابت ہوگا۔ مگر یہ ان سب کی غلطی تھی۔ لیکن وہ بات کہ سامنے کھلی ہوئی زمین نہ تھی جہاں وہ باغیچہ لگا سکتے اور کم سے کم گیندے کے پھولوں ہی سے دل بہلاتے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو کتنی بڑی غلطی ہوتی۔

مدبر نے حیرانی اور پریشانی کے عالم میں آکر کہا۔ پولیس آئی ہے۔ کیوں؟ خیال ہوا شاید کوئی اچکا یا اٹھائی گیرا کہیں سے بھاگ کر گھر میں پناہ لینے آگیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں آگئی ہے۔ مگر خرگوش والی بات ہوئی کہ جب وہ شکاری

کے سامنے سے کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں پاتا تو آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہے اور سوچتا ہے ــ میں تو کسی کو نہیں دیکھتا اس لئے مجھے بھی کوئی نہیں دیکھتا۔ چور تو وہ خود ہی ہیں۔ وہ جسموں کے ساتھ آنکھیں بھی چھپائے ہوئے ہیں۔

پولیس سب انسپکٹر قدیم زمانے کا ہیٹ بغل میں دبائے اپنی داغدار پیشانی سے پسینہ پوچھ رہا تھا۔ ایک معصوم انداز۔ اس کے پیچھے بندوق والے دو کانسٹبل، بڑی بڑی مونچھوں والے ہونے ہوئے بھی معصومانہ انداز لئے۔ خاموش وہ گھر کی شہتیریں، دروازے اور جنگلے شمار کرنے لگے۔ اوپر ایک شکستہ سوراخ میں ایک جوڑا کبوتر نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ایک سفید ہے اور دوسرا خاکستری۔ پولیس والے اسے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہاتھوں میں بندوق جو ہے۔

متین نے سنجیدگی سے پوچھا ــ آپ کسے چاہتے ہیں؟

ــ آپ سب لوگوں کو، آپ لوگوں نے بے ضابطگی سے اس گھر پر قبضہ کیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر آپ لوگوں کو یہ گھر خالی کر دینا ہوگا۔ یہ کہہ کے حکمنامہ دکھایا۔

معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا مالک ٹرین ہی پر سے واپس آگیا ہے۔ یہاں اس نے یہ حالت دیکھ کر سیدھا تھانے میں جا کر اطلاع دی ہے۔ پتہ نہیں وہ بھی ساتھ آیا ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے افضل نے ذرا اچک کر دیکھنا چاہا۔ پیچھے محض وہ دو مونچھوں والے سپاہی ہی تھے جو بندوقیں سنبھالے ہوئے تھے۔

ــ کیوں؟ کیا گھر والے نے کوئی نالش کی ہے؟

ــ حکومت نے یہ گھر ریکوزیشن کیا ہے۔

وہ بہت دیر تک لاجواب اور خاموش رہے آخر متین نے کہا۔

ــ ہم لوگ بھی تو گورنمنٹ ہی کے آدمی ہیں ۔

کبھی کبھی انسانوں کی حماقتیں دیکھ کر لوگ حیران رہ جایا کرتے ہیں۔ باتیں سن کر دونوں کانسٹیبل شہتیروں کا شمار چھوڑ کر نیچے کی طرف دیکھنے لگے ۔ ان کی بے خیال نظروں نے اپنی باتیں خود ہی کہہ ڈالیں ۔

اس کے بعد اس گھر پر جیسے ایک تاریک سایہ آپڑا ۔ اب فکروں کی حد نہیں ۔ یہی فکر کہ اب جائیں کہاں ۔ بعض نے ناراضگی کے ساتھ کہا ــ ہم یہیں رہیں گے ۔ دیکھیں کون ہمیں اٹھاتا ہے ۔ اگر کسی نے اس گھر کی چوکھٹ میں قدم رکھا تو اسے ہماری لاشوں پر سے گذرنا ہوگا ۔ (فلاں جگہ تو طلبہ نے محض زور زبردستی کی بنا پر ایک گھر قبضے میں لے لیا ہے ۔ انہیں بے دخل کرنے کی کوشش میں حکومت کے بعض اعلیٰ افسران بھی نیست و نابود ہوگئے ہیں ۔ وہی باتیں یاد آتی ہیں) بالآخر ان کے خون میں بھی گرمی آ ہی گئی ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز ہرگز یہ گھر نہ چھوڑیں گے ۔ جسے آنا ہو آئے مگر یہ سوچ کر آئے کہ اسے ہماری لاشوں پر سے گذرنا ہوگا ۔

چند دنوں تک گرم خون رگوں میں دوڑتا رہا ۔ کام میں دل نہیں لگتا ۔ کھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ بس باتیں ، تیز تیز ، گرم گرم باتیں ۔ آخر رفتہ رفتہ باتوں میں کمی آ گئی ۔ باتیں ختم ہو گئیں اور پھر خون کے ٹھنڈے ہونے میں کتنے دن لگتے ہیں ۔

یہ تو طالب علم نہیں ہیں ۔ یہ کون لوگ ہیں اس کے بارے میں تو وہ خود ہی پولیس کو بتا چکے ہیں ۔ گھر ریکوئی زیشن ہونے کی خبر پاکر لاجواب ہوتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ــ کیوں ؟ ہم لوگ بھی تو گورنمنٹ ہی کے آدمی ہیں ۔

ایک دن وہ اپنا دلی بل لے کے رخصت ہوگئے۔ جس طرح وہ طوفانی ہواؤں کی صورت آئے تھے و یسے ہی آندھی کی طرح روانہ ہوگئے۔ سارے گھر میں پرانے اخبار کے ٹکڑے، کپڑے سکھانے کی پرانی الگنی، بیڑی اور سگریٹ کے پس خوردہ ٹکڑے یا پھٹے جوتے کے تلے۔ نیلی کوٹھی جیسے گھر کے دروازے جنگلے پھر سنسان ہوگئے۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد ان پر رنگین پردے نظر آئیں گے

پچھے باورچی خانے کے قریب تلسی کا درخت پھر سوکھنے لگا ہے۔ اس کے پتے پھر کتھئی رنگ کے ہوگئے ہیں۔ جس روز پولیس نے آ کر گھر چھوڑنے کا حکم دیا تھا اسی دن سے اس درخت کو پانی ملنا بند ہوگیا۔ تلسی کے درخت ہی کو نہیں اس گھر کی مالکہ کی آنسو بھری ڈبڈبائی آنکھیں بھی کسی کو یاد نہ رہیں۔

وہ آنسو بھری آنکھیں کیوں یاد نہ آئیں اسے کون بتائے۔ وہ تلسی کا درخت جسے انسان اگر چاہے تو رکھے اور چاہے تو برباد کردے یعنی جس کی زندگی اور موت دوسروں کے قبضے میں ہے اور خود اس کا اپنا ہاتھ اس کی زندگی کے بارے میں معذور ہے۔

سردار زین الدین

موضع چرکھانورا ، تھانہ شجاع نگر ضلع پٹنہ میں ۱۹۶۲ء میں ایک متوسط خاندان کے درمیان سردار زین الدین نے جنم لیا - ان کا اصلی نام محمد زین الدین بسواس ہے - جنگ عظیم ثانی میں انھوں نے کالج کی زندگی کو خیر باد کہہ کر معرکۂ جنگ میں شرکت اختیار کی - لڑائی کے دوران اخبارات میں مضامین نویس کے لئے انھوں نے ایک فرضی نام سردار زین الدین اختیار کیا - متوسط مسلمان گھرانوں کی افلاس زدہ زندگی کا نقشہ ان کی تحریر میں عریاں نظر آتا ہے - اب تک ان کے افسانوں کے مجموعہ تین دولی ، بیرکنھٹی ایر بی اے اور کھرسروت ، نیز ناول نگار کی حیثت سے ان کی کتاب آدمی گنتو اشاعت پذیر ہوکر شہرت حاصل کی ہے - فی الحال وہ بنگالی اکادمی میں معین نشرواشاعت کی حیثیت سے کام کرہے ہیں-

بتاشی

سورج پچھم سے طلوع ہوسکتا ہے ، کابلی بغیر سود کے قرض دے سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مدین بتاشی کے ساتھ بازار میں موجود نہ ہو . دوپہر کا سورج مغربی آسمان کی طرف اک ذرا جھکتے ہی مدین اپنے گھر کے مغربی ٹیلے کے گوشے پر کھڑے ہو کر بائیں ہاتھ سے آنکھ پر سایہ کر کے بار بار سورج کی طرف دیکھتا ہے کہ اب کیا وقت ہوا ہوگا . وہ بار بار دیکھتا ہے کہ ڈھائی پہر گذری یا نہیں . دل ہی دل میں کہتا ہے ــ نہیں ابھی ذرا سویرا ہے . ابھی ذرا اور وقت باقی ہے .

پھر وہ بتاشی کو کسی قدر گھاس ، چاول کی بھوسی پانی میں بھگا کر اور اس میں برائے نام بھیگی ہوئی کھلی ملا کر کھانے کے لئے پیش کرتا ہے . ساتھ ہی ساتھ کہتا ہے ــ کھا بتاشی کھا ، جلدی جلدی تھوڑا سا کھا لے پھر ذرا آنکھیں بندکر کے آرام لیلے . دیکھ بازار کا وقت قریب آ پہنچا .

بتاشی اک ذرا ، ہنہناتی ہے . پھر گردن اٹھا کر اسے حرکت دیتی ہے ، گویا آج اسے بازار جانے کی خواہش نہیں ہے جسم بھاری بھاری لگتا ہے . مدین اک ذرا متفکر انداز سے اپنے ہاتھ بتاشی کے جسم پر پھیرتا اور کہتا جاتا ہے . میں سمجھتا ہوں ، بتاشی میں

سب سمجھتا ہوں ۔ اب بوڑھاپا ہے نا ، اسی لئے تکلیف برداشت نہیں ہوتی ۔ بس اب تھوڑے دن اور پھر تجھے پنشن دے دوں گا ۔ اس وقت راج سکھ میں زندگی گذارنا ۔ کھانا اور سونا ۔ اس دفعہ موسم گذار دے اور بس پھر سردیوں کے آخر میں تجھے ہری ہر چھتر لے جاؤں گا ۔ جانتی ہے ہری ہر چھتر ، وہی پچھم دیس کا میلا ۔ وہاں بہت سے بدیسی بڑے بڑے ٹٹو اور گھوڑے آتے ہیں ۔ وہاں سے لوٹ کے بس ایک بچہ اور دیدے اور تجھے چھٹی ۔

بتاشی گویا مدین کی ساری باتیں سمجھ گئی اور کھاتے ہی کھاتے اس نے سر آٹھا کے ہینی ہینی کیا ۔ گویا یہ ماں بننے کی لذت کا اظہار تھا ۔

مدین اک ذرا ہنس کر بولا ۔ کیوں اعتبار نہیں کرتی ؟ ارے و سب سمجھتی ہے ۔ نہیں نہیں اب ایسا نہ ہو گا ۔ اب کی تجھے ضرور لے جاؤں گا ۔ اس دفعہ بیماری کی وجہ سے نہیں جاسکا تھا مگر اب کی ویسا نہ ہوگا ۔ یہ کہہ کے اس نے گھر کے بیڑے سے بانس کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور بھوسی الٹ پلٹ کے ہنسنے لگا ۔

اس کی بیوی پلچھری پکار تی ہے ــ کھچڑی ٹھنڈی پانی ہو گئی ۔ کھالو نا !

مدین کہتا ہے آتا ہوں ، آتا ہوں ۔

بتاشی جب اپنے تین پاؤں پر لنگڑا کر چلتی ہے تو عجیب سی لگتی ہے ۔ لوگ ہنستے ہنستے کہتے ہیں ــ

مدین کی لنگڑی گھوڑی ــ چلتی ہے دور تھوڑی ۔

مدین غصے سے جواب دیتا ہے ــ بوڑھاپے میں تم ایسے ہی ہو جاؤ گے ۔ ابھی کیا ہے ، اس بتاشی کی بھی کبھی جوانی تھی ۔ تب وہ بتاشی (ہوا) سے بھی آگے آگے دوڑتی تھی ۔ اسی لئے تو اس کا

نام بتاشی پڑا .

کب، کس نے اُسے بتاشی کا نام دیا تھا. اس کی خبر ھی نہیں: واقعی یہ ھوا سے باتیں کرتی بھی تھی یا نہیں یہ کون جانے ؟ مگر مدین نے یہ یقین کرلیا ھے کہ کبھی واقعی وہ بتاش (ھوا) سے بھی آگے آگے دوڑتی تھی. میلے میں ایک شرط جیتنے کے سلسلے میں اُس کا اگلا داھنا پیر اکھڑ گیا تھا اور تبھی سے وہ لنگڑی ھے .

بازار جمنے سے پہلے ھی مدین اپنی بتاشی کو لئے بازار کی رونق بن جاتا . ساری سہ پہر وہ تین پیروں پر گذار دیتی اور چپ چاپ اونگھتی رھتی .

گنج کے بازار سے پھرتے پھراتے مدین کی آدھی رات بیت جاتی . واپسی پر پہلے مدین بتاشی کو کھلاتا ھے اور پھر خود کھانے بیٹھتا ھے . کبھی کبھی مدین اپنی بیوی پھلجھری کو گالی گلوچ بھی کرتا رھتا ھے ــ ھاں ، اپنے کھانے کا وقت تو ٹھیک ھے نا ، گرم گرم کھا کے بستر بچھا لیا ھے . جس کی کمائی کھاتی ھو اُس بے زبان جانور کے کھانے پینے کی فکر ھی نہیں ھے . ایک آنٹی پیال کاٹ کے ایک گھڑے پانی میں بھگا رکھنے سے کیا ھوتا . اتنی بات یاد نہیں رھتی .

پھلجھری اس وقت نیند کی ماتی ھوتی . مدین کہتا جاتا اور جاڑے میں کانپتا کانپتا بھوسی بھگا کے بتاشی آگے رکھ دیتا .

بتاشی تمام دن کی محنت کے بعد کھلی ملی ھوئی بھوسی کھا کے خوشی میں ھنہناتی . مدین کہتا ــ کیا بتاشی کیا . میں تیرا قرض نہ چکا سکوں گا . بے زبان کا قرض کون ادا کر سکے .

بتاشی ! تونے ھی تو زندگی بچائی ھے .

اسی طرح روٹین کے مطابق کام ھوتا جاتا ھے . مدین کا

تقریباً آدھا جیون یونہی گذرا ھے ۔ یکا یک ایک دن اس روٹین میں تبدیلی آ گئی ۔ لنگ کھانے کھاتے جو زندگی بڑھتے بڑھتے آگے کو رواں تھی اس کی رفتار اس دن یکایک الٹ پلٹ کر تھم گئی۔ لوگ حیران رہ گئے ۔ بتاشی اور مدین کا بازار آنا بند ھوگیا ۔

دریا کے کنارے کا راستہ ناھموار ھے ۔ بارش کے پانی سے کنارہ اور بھی دھوکٹ گیا ھے ۔ دن کو ایسا نظر آتا ھے جیسے کسی نے نالیاں کاٹ دی ھیں ــ رشک مودی نے اس دن مدین سے کہا تھا ۔ بیپاری جانتے ھو ! ماں پدما اب کی سال لیسدار مٹی کو توڑ کھا نہ سکی اس لئے اس نے جگہ جگہ سے لقمے اٹھا لئے ھیں۔ بیٹی تو امیدی سے رھے گی مگر سڑک بننے کی توقع پوری ھوتی نظر نہیں آتی ۔ اس کا تو خاتمہ ھی ھوگیا ھے ۔ اب تو رات برات گنج سے گھر لوٹنا بھی مصیبت بن گیا ھے ۔

روز کی طرح اس دن بھی مدین گنج کے بازار میں کرایہ دے کے گھر لوٹ رھا تھا ۔ اندھیری رات میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا ۔ بیچ بیچ میں دو چار دوکاندار بازار سے پھرتے پھراتے گھر پلٹ رھے تھے ۔ کسی کے ھاتھ میں لالٹین اور کسی کے ھاتھ میں بتی ٹمٹا رھی تھی ۔ بعض بعض کا شیشہ تو بالکل ھی سیاھی سے منڈھ گیا تھا ۔ اور وہ برائے نام روشنی کہلا سکتی تھی ۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ اس کے اندر روشنی موجود ھے ۔ مدین کی ان سے راہ میں ملاقات ھوئی ۔ مدین نے پہلے ھی کہا ــ کون ھے بھائی ، بیپاری ؟ ذرا سنبھل کے چلو ۔ گھوڑا آرھا ھے ۔

کسی واقف کار نے پکار کے کہا ــ کون ، مدین بیپاری ھیں کیا ؟

مدین نے کہا ــ ھاں بھئی ۔

— ارے بھئی لنگڑے گھوڑے کے سوار ذرا سریرے ہی گھر لوٹا کرو نا . اس اندھیری رات اور خراب راستے میں کیا مرنے کی نیت ہے ؟

مدین نے غصے سے جواب دیا . اپنے چراغ میں تیل ڈالو .

پھر اور کوئی بات نہ ہوئی . سب چپ چاپ چلتے رہے . دل ہی دل میں باتیں ہورہی ہیں .

گھر میں آٹھ ہے . آج ہوا ڈیڑھ . ساڑھے نو . یہ تو اصل ہے اور باقی آٹھ آنہ . مدین سوچ رہا ہے . گھوڑی کو جفتی کھلانے میں دس روپئے کا خرچ ہے. گھوڑے والے دس روپیہ سے کم نہیں لیتے. آنے جانے اور کھانے پینے میں تین چار دنوں کے لئے دو ایک روپیہ ہونے ہی سے کام چل سکتا ہے. اور فضول خرچی ہی کیا ہے. خرید فروخت کے لئے دو چار پیسہ کافی ہے . بس یہی بیڑی اور ماچس. کل پرسوں بازار میں اتنا تو ہوسکتا ہے . اچھا دو چار دن اگر مچھلی بھات نہیں کھایا تو کیا بگڑتا ہے . بس ان چند دنوں کے لئے وہ بازار کی خرید بندکر دے گا. پھر اپنی محنت سے جوکچھ مل سکے گا اس میں آس کا نیز پھلجھری اور بتاشی کا پیٹ چل ہی جائے گا . جب بتاشی کے بچہ ہو گا تو پھر پوچھنا ہی کیا . مدین خود ہی کہتا اور خودہی ہنستا .

یکایک ندی کے کنارے کے نیچے سے "کو" کی ایک آواز آئی . بتاشی چونک پڑی اور مدین کا جسم بوجھل سا ہو گیا .

کالی تلا کی یہ جگہ اچھی نہیں ہے مرگھٹ کے اوپر سے راستہ ہے . بہتیرے یہاں خوف کھا کے مر چکے ہیں . جسم جھنجھنانے لگا . مدین پہلے کی طرح زبان تالو سے لگا کے ٹک ٹک آواز نہ نکال سکا . نہ جانے زبان کیسے پھسل گئی اور آواز نہ ہو سکی .

بتاشی اسے سمجھ گئی اور اب اس نے تیز روی دکھانی چاہی مگر توازن کھو کر نیچے گڑھے میں جا گری۔

جیسے لٹو گھومتا ہے آسی طرح تیز تیز مدین کا سر بھی چکر کھانے لگا بس اتنا ہی اسے یاد رہا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ پھلجھری اس کے سرھانے بیٹھی سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس نے آدھی آنکھیں کھول کر پھلجھری سے پوچھا — پھلجھری، بتاشی، میری بتاشی کیسے ہے؟

پھلجھری نے ذرا غصے سے کہا — پہلے خود تو بچو پھر بتاشی کو دیکھو — وہی سبز پیری تو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔

مدین کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی مگر نگاہوں کے اندر سے جیسے شعلے نکل گئے ہوں۔ ایسا محسوس ہوا اور وہ کروٹ بدل کر سو رہا۔

پھلجھری سرکاری دواخانے سے دوائیں لائی جس سے مدین بھلا چنگا ہو گیا۔

تندرست ہونے پر اس نے جو کچھ دیکھا اس سے یہی محسوس ہوا کہ اگر صحتمند نہ ہوا ہوتا تو بہتر تھا، بتاشی کا لنگڑا پیر پھول کر کیلے کے درخت جیسا ہوگیا تھا۔ شاید وہ بالکل ٹوٹ ہی گیا تھا اور اب بتاشی نکمی ہو چکی تھی۔

مدین آہستہ آہستہ کہتا — بتاشی! کیسی ہے رے؟ بہت تکلیف ہے نا۔

مدین کی آواز سن کر بتاشی ہنہناتی اور روتی ہے۔ ضعیفی اور پاشکستگی کا درد اس کی غمزدہ آواز سے ظاہر ہوتا اور مدین کا اصطبل ماتم کدہ بن جاتا۔ اس کی حسرتناک آواز سن کر مدین کا دل جیسے پارہ پارہ ہوجانا چاہتا ہے۔ مدین بتاشی کو تسلی دیتا —

بتاشی! نہ رو. میں تجھے تندرست کر کے ہی دم لوں گا. میں تیرے لئے روشن پور کے کبیراج سے دوا لاؤں گا ۔ بتاشی کے منہ سے قریب بیٹھ کر اس کے جسم پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے پھیرتے وہ کہتا ــ وہ دوا بہت اچھی ہے ۔ بڑی صحت بخش. ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑجاتی ہیں ، زہر باد بات کہتے کہتے دور ہوجاتا ہے ۔ بتاشی ، تو نہ ڈر تجھے فکر کیسا ؟ اور بتاشی اپنی گردن مدین کے کندھوں پر رکھ کر ہنہن ہنہن کرتی رہتی ہے ۔

مدین کہتا رہتا ــ بہت درد ہے نا رے؟ ہائے ہائے ، تو نے کتنے آنسو بہائے ہیں ۔ مدین یہ کہتے کہتے دو چار کھروں سے اس کے آنسو پونچھ دیتا ۔ پھر کہتا ــ ارے تونے کچھ کھایا بھی ؟ کچھ دانا پانی پیٹ میں پڑا ہے ۔

بتاشی پھر درد میں ڈوبی ہوئی آواز نکالتی ۔ کئی دن تک وہ پیٹ بھر کے کھا بھی نہ سکی ۔

مدین پھلجھڑی کو ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ سناتا ــ ارے تو بتاشی کو تھوڑی بھوسی بھی نہیں دے سکتی؟ تو تو انسان ہی نہیں ہے ۔ وہ گالیاں دیتے دیتے خود ہی آہستہ آہستہ اٹھ کر جاتا اور پھر بہت تکلیف کے ساتھ خود ہی بتاشی کے لئے بھوسی بھگا دیتا ۔

کیا ڈر ؟ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو کل صبح ہی روشن پور جاؤں گا ۔ اچھی ہو جائے تو اور کچھ کام نہ لوں گا بس پھر سیدھا ہری ہر چھتر ۔ سمجھتی ہے ؟

بتاشی اپنے معمول کے مطابق آواز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی جیسے وہ سب کچھ سمجھتی بوجھتی ہے مگر وہ اگلی سی ہنسی اس کے چہرے پر مفقود ہے ۔

مدین اک ذرا دکھی ہو کر کہتا ہے ــ ارے تو روپیے کی بات سوچتی ہے ۔ فکر نہ کر ۔ اس کی تجھے کیا فکر ۔ جیسے بھی ہو روپیہ میں فراہم کروں ہی گا ۔ گھر میں جو کچھ ہے میں اسے بیچ ڈالوں گا ۔ مدین نمک حرام نہیں ہے۔ ہرگز نمک حرام نہیں ہے ۔ جو کچھ ہے وہ تیرا ہی کیا ہوا ہے نا ! میرا کیا ہے ؟ بس دو عدد کھر کے جھونپڑے اورچند ایک کانسے کے برتن یا وہ چوکی ۔ اور کیا ۔ یہ سب تونے ہی کمایا ہے اور تیرے ہی علاج معالجہ پر خرچ ہو گا ۔

بتاشی کیسی درد بھری آنکھوں سے مدین کا منہ تکا کرتی ہے ۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر مدین کا دل بھر آتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں ۔ وہ بائیں ہاتھ سے آنکھیں پونچھتا ہے اور داہنے ہاتھ سے بتاشی کے جسم کو سہلاتا ہے اور کہتا ہے ــ اس میں میرا کیا ہے ؟ تو کیوں غمگین ہوتی ہے ؟ یہ ٹوٹا گھر اور وہ مجروح چوکی کیا میرا باپ چھوڑ گیا ہے ؟ یہ تو تیرے ہی جسم و جان کی کمائی ہے اور تجھی پر لگے گی ۔

سچ مچ یہی ہوا ۔ جو کچھ نقد تھا اور جتنا سامان تھا سب بیچ کھونچ کر مدین نے بتاشی کا علاج معالجہ کیا ۔

پھلجھری نے منع کیا تھا ۔ اس نے کہا تھا ــ یہ کیا کر رہے ہو ؟ بالآخر نہ کھا کے مرو گے ۔

مدین نے پھلجھری کو گالی دے کر کہا تھا ــ تو کیا جانے مسلمان کبھی نمک حرام نہیں ہوتا ۔ تو تو غیر مہذب دیہاتی ہے ۔ دنیا میں تونے بس اپنا ہی پیٹ پہچانا ہے مگر جس کی کمائی پیٹ میں جاتی ہے اسے پہچانا ہی نہیں ۔

پھلجھری نے پھر کچھ نہ کہا ۔ بس وہ منہ پھلائے چپ ہو رہی

مدین نے روشن پور کے کبیراج کو گڈی کے گڈی ڈیڑھ کوڑی روپئے گن دئے اور اسی کی دوا سے بتاشی بھلی چنگی بھی ہو گئی۔ اب وہ اٹھتی ہے اور کچھ چلنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔

مدین ہنس کے کہتا ہے ــ بتاشی! اب کیسی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ دوا نہیں تریاق ہے۔ اچھا اور چند دن گذرنے دے پھر تجھے ہری ہر چھتر لے چلوں گا۔

یہ کہنے کے بعد مدین نے اپنے اصطبل میں سے شکستہ و ریختہ وہ گدی نکالی جو بتاشی کی پیٹھ پر باندھتا تھا۔ اسے گرد و غبار سے صاف کیا اور مرمت کرنے بیٹھ گیا۔ بتاشی اپنے ٹوٹے ہوئے پیر ہی سے زمیں پر ہلکے ہلکے ٹاپ مارنے لگی۔ وہ اپنے پیروں کی طاقت کا شاید اندازہ کرتی تھی۔ مدین گدی رکھ کر بتاشی کی طرف دیکھنے لگا۔ بتاشی نے پاؤں روکے تو اس نے ہنس کر کہا ــ بتاشی! کچھ طاقت آئی؟ پاؤں کا کیا حال ہے؟

بتاشی ہنہناہنہنا کے اپنی مسرت ظاہر کرتی۔ شاید یہ کہنا چاہتی کہ بس دو چار دنوں ہی میں وہ ہری ہر چھتر جانے کے لائق ہو جائے گی۔ اب آسے تکلیف نہ ہوگی۔ مدین بھی ہنس ہنس کر دل کی مسرت ظاہر کرتا۔

مدین کئی روز سے برآمدے میں بیٹھا لال ساڑی اور لنگی کے ٹکڑے، پھٹی ہوئی قمیض اور پرندوں کے پر وغیرہ ملاجلا کر بتاشی کی نئی گدی تیار کر رہا ہے۔ آسی پرانی گدی پر نئی تہیں چڑھائی گئی ہیں۔ چند دنوں تک یہی ورزش ہوتی رہی۔

لوگ دیکھتے اور کہتے ــ کیوں بیپاری، کیا ہاٹ بازار بالکل ہی چھوڑ بیٹھے؟

مدین ہنس کر جواب دیتا ــ ہاں بھئی بتاشی کو پنشن دیدی

ہے . بس اب آسے ہری ہر چھتر سے جفتی دلا لاؤں تو کام بنے . کام تو پھر ہے ہی .

بعض بعض کہتے ــ بیپاری اس بوڑھی مینا کو بیچ بھی ڈالو .

مدین کو رنج ہوتا ــ بوڑھی مینا ! ارے تیرے باپ دادا چودہ پشت نے بھی کبھی اتنی بڑی گھوڑی دیکھی ہے ؟ تم اپنی گدھیا کو بیچو .

آخر ہری ہر چھتر جانے کا دن آ گیا . مدین بتاشی کو پدما ندی سے خوب دھو مانج کر دلھن بنا لایا . آج جیسے مدین کا انگ انگ خوشی سے پھوٹا پڑتا ہے . آس کا دل آج اندر سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچپن کا وہ گانا گائے جو جاترا کے موقع پر گایا کرتا تھا .

میری سونے کی چڑیا آڑ گئی رے۔ دیدی پکڑو ناڈ ینا، آڑ گئی رے .

وہ واقعی گنگناتے ہوئے کوئی سر الاپنے لگا .

بتاشی کا جسم بھی آج نئے روپ میں چمک رہا ہے. جیسے دس سال کی پچھلی جوانی پھر پلٹ آئی ہے . جسم میں پھر جوار کا زور ہے . جولانی طبع کا اظہار آج دم کی بار بار جنبش اور ہنہناہٹ کر رہی ہے .

مدین نے آج بہت ساری بھوسی اور کھلی آسے کھانے کے لئے دی اور کہا ــ بتاشی، ہری ہر چھتر بہت دور ہے. اچھی طرح پیٹ بھر کے آج کھالے . کھالے ، کھالے ، جلدی جلدی کھا کے تیار ہو جا . ذرا میں بھی ناشتہ کرلوں. یہ کہہ کے وہ گھر میں چلا گیا .

آس نے گھر میں جا کے دیکھا ۔ آج پھاجھری نے کچھ پکایا وکایا نہیں ہے ۔ پوچھتے ہی وہ پھٹ پڑی ۔ جاؤ بتاشی کا گوشت

کھاؤ ۔ گھر میں چاول دال کچھ نہیں ہے۔

مدین نے کچھ جواب نہ دیا ۔ بس اس کے چہرے پر ایک دکھ بھری ہنسی دوڑ گئی ۔ آس نے لنگی کی کھونٹ سے اپنی جمع نکالی اور گن کر دیکھا ۔ اس میں بس اس کا اپنا راہ خرچ اور آٹھ آنہ فاضل تھا۔ آس نے وہ اٹھنی پھلجھری کے ہاتھ پر رکھی اور کہا۔ میرا پیٹ بگڑا ہوا ہے۔ میں کچھ نہ کھاؤں گا ۔ تم اپنے کھانے کا بندو بست کرو ۔ یہ کہتے ہوئے وہ جونہی باہر نکلا بس چونک پڑا ۔ چھپ چھپ کر کے بتاشی رو رہی ہے ۔ زمیندار کی کچہری کا پیادہ اور اس کے معاون بتاشی کو گھسیٹے لئے جارہے تھے ۔ بتاشی چھپ چھپ کر کے رو رہی تھی ۔ زمیندار کے نائب نے کہا ۔ تم نے تین سال کا محصول جمع نہیں کیا ہے اس لئے یہ گھوڑی قرق کی جاتی ہے ۔ اب یہ نیلام پر چڑھائی جائے گی ۔

بتاشی اپنے آپ کو چھڑانے کی انتھک کوشش کرتی رہی اور چھپ چھپ کر کے روتی رہی ۔

مدین پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ۔ بس وہ گالوں پر ہاتھ رکھے خاموش لب اور آنسو بھری آنکھوں سے بتاشی کو دیکھتا رہا ۔ وہ ہاں ، ہوں کچھ بھی نہ کہہ سکا ۔ بس آنکھوں پر زور تھا اور وہ ساون بھادوں کا سماں دکھانے لگیں ۔

شاهد علی

شاهد علی ۱۹۲۵ء میں مشرقی پاکستان کے نوداخل شدہ ضلع سلہٹ کے محکمہ شونام گنج کے موضع محمد پور میں پیدا ہوئے- تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں تک بوگرا اور رنگ پور کے کار مائیکل کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے - اس کے بعد وہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں ممبر کی حیثیت سے بھی منتخب ہوئے- شاہد علی اپنے تعلیمی دور ہی سے قومی خدمات کے کاموں میں پرجوش حصہ لیا کرتے تھے- لیکن ان کی عظیم شہرت ادبی کارناموں ہی کی رہین منت ہے- طالب علمی کے زمانے ہی سے انھوں نے محمدی اور سوغات وغیرہ ادبی رسالوں کے ذریعے ادب کی خدمت شروع کی تھی - خاص طور پر وہ افسانہ نگارہیں - ان کا افسانہ "جبرئیل ایرؑ دانا" جو کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے ان کا شاہکار ہے- یہ افسانہ دراصل ان کے بہت سارے افسانوں کے مجموعہ میں سے ایک ہے جس نے کتاب کا نام پایا ہے - اکثر اوقات میں مختلف اخبارات کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے انجام دئے - فی الحال وہ ڈھاکہ کی اسلامک اکیڈمی میں ایک اخبار کی ادارت کا فرض انجام دے رہے ہیں -

جبرائیل اڑانا (جبریل کا بازو)

جو راستہ عظیم پور سے ہوتا ہوا پیل خانہ روڈ کی طرف جاتا ہے اس میں بائیں سمت درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہے۔ گھر کی شکستہ دیواروں کا اوپری حصہ بہت دنوں پہلے ہی اڑ چکا ہے۔ اس لئے پانی، دھوپ اور ہوا کے داخلے کے لئے اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ زنگ کھائے ہوئے بہت پرانے اینٹوں کے سوراخ سے نیلے آسمان کا بھی جا بجا نظارہ ہو سکتا ہے۔

ایک ماں اور اس کا لڑکا چٹائی پر سویا ہوا ہے۔

شام کے وقت حلیمہ نے نبی کو بہت مارا تھا۔ نبی اپنی عمر کی چھ برساتیں گذار کر ساتویں میں قدم رکھ چکا ہے۔ حلیمہ نے اسے ایک بیڑی بنانے والے کی دوکان میں داخل کر دیا ہے۔ اگر وہ کام نہ سیکھے گا تو دن کیسے گذار سکے گا۔ نبی کے باپ کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب وہ ابھی دودھ پیتا بچہ تھا۔ حلیمہ تنہا اس کے لئے کیا کر سکتی ہے اسے اپنا ہی پیٹ پالنے کے لئے سات گھروں کا طواف کرنا پڑتا ہے اگر کام نہیں ملتا تو بھیک ہی پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ اور شام کے وقت عظیم پورہ گورستان کے پھاٹک پر بھی بیٹھنا پڑتا ہے۔ شام کو جب زائرین قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں اور کچھ دان خیرات کرتے ہیں تو اس میں سے دو چار پیسہ کبھی کبھی اس کے پلے بھی پڑجاتے ہیں۔ نبی بلا

تنخواہ بیڑی کی دوکان میں کام کرتا ہے ۔ دوکاندار نبی کو صرف دو پہر کا کھانا دیتا ہے۔ ابھی وہ بیڑی کے کام میں ناتجربےکار ہے۔ پختہ کار ہو جانے پر اسے پانچ روپیہ ماہوار ملے گا ۔ مگر آج کل نبی نے دھوکا دینا شروع کیا ہے ۔ کسی بہانے دوکان سے ایک بار نکلنے کے بعد پھر گھنٹوں کےلئے لاپتہ ہو جاتا ہے ۔ دوکاندار تین بار حلیمہ سے اس کی بابت شکایت کر چکا ہے اور آج اس نے متنبہ کیا ہے کہ اگر نبی نے اپنے آپ کو نہ سدھارا تو اسے کام سے الگ کر دے گا۔ اسے ایسے شریر لڑکے کی ضرورت نہیں ہے ۔ شام کو حلیمہ غصے سے آگ بگولہ ہوگئی ۔ اگر لڑکے نے کوئی کام نہ سیکھا تو پھر وہ اس دنیا میں کیا کرے گا۔ لڑکا مگر ایسا لاپروا کہ اس کام میں اس کا دل لگتا ہی نہیں ۔ آخر دل لگنے کی بھی کیا بات ہے ؟ ماں تو اس کے لئے بھیک بٹورنے کے واسطے موجود ہی ہے ۔ وہ ماماگیری کرے گی اور اسے پالے گی۔ آج نبی کے لوٹتے ہی حلیمہ نے اسے بےتحاشہ پیٹ دیا۔ اس کی پیٹھ پر دھوں دھاں کر کے کتنے ہی گھونسے لگائے ۔ آخر نبی سارا دن کہاں گذارتا ہے ؟ یہی جاننے کے لئے حلیمہ نے مار دھاڑ کی ۔ مگر نبی کے منھ سے کوئی جواب نہ نکلا ۔ وہ بس پھوٹ پھوٹ کر روتا ہی رہا اور بے کھائے پئے سو گیا ۔

حلیمہ کھانا کھانے بیٹھی مگر ایک آدھ لقمہ بھی نگل نہ سکی ۔ آج وہ بھی بھوکی ہی رہی۔ حلیمہ نے اسے کتنا سمجھایا مگر بات اس کے دل میں نہ بیٹھی۔ آسے ماں پر ناز بھی تھا اور ضد بھی۔ و ایکبار آنکھیں مل اس نے حلیمہ کی طرف دیکھا اور بس ۔ پھر بنا کے اس نے اپنے آپ کو نیند کی آغوش میں ڈال دیا ۔

سڑی گلی دیوار کے بالائی حصے سے حلیمہ نے آسمان کو دیکھا ' ایک ہاتھ نبی پر تھا ۔ نبی کی پیٹھ پر کتنی قمچیاں توڑنے کے

باوجود حلیمہ کے دل کو آج جیسا دکھ کبھی نہیں ہوا تھا ۔ آج وہ اپنے دل میں بڑا درد محسوس کر رہی تھی ۔ وہ محو خواب بچے کے جسم پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی ۔ یہ بھی تو سچ ہے کہ اتنے کم عمر بچے سے زیادہ سمجھ کی توقع بھی کیا ہو سکتی ہے ۔ باپ تو دنیا سے گذر کر ہمیشہ کے لئے رہائی پاچکا ہے اور ماں باپ دونوں کی ذمہ داری لئے بد نصیب حلیمہ زندہ ہے ۔ اس طرح بار بار اسے پیٹنا بھی تو پڑا ہے ۔ لیکن اگر وہ کچھ بھی نہ سیکھے تو اس دنیا میں وہ کیسے زندگی گذارے گا ؟ آخر حلیمہ تو زندگی بھر اس کا ساتھ نہ دے سکے گی تاکہ وہ بے فکر ہی رہ جائے ۔

حلیمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں ۔ اب اس نے آسمان سے نظریں ہٹا کے نبی کی پیشانی پر بوسہ دیا ۔

نبی نے آہستہ آہستہ آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا اور دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ــ ماں ، وہ کون ہے ؟

ــ کہاں رے ؟ حیران و پریشان حلیمہ نے پوچھا ۔

ــ وہی تو چلا گیا۔ نبی نے ہاتھ بڑھا کے اس اجنبی کے جانے کی راہ دکھا دی ۔

حلیمہ نے بیچینی کے ساتھ کہا ــ نہیں نہیں، کوئی نہیں ہے۔

ــ تم چھپانا چاہتی ہو ؟ نبی نے ناز کے انداز سے کہا ــ ابھی ایک خوبصورت آدمی نہیں گیا ہے ؟ خوب چمکدار رنگ اور پہننے کا کپڑا بہت اچھا ۔

ــ خوب صورت آدمی ؟ حلیمہ کی پریشانی اب اور بڑھ گئی ۔

ــ ہاں نبی نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کے کہا ۔ وہ مٹھائی لئے آیا تھا ۔ اماں وہ تو تمہارے پاس ہی سے گذرا ہے نا ؟

ــ ہوں . دے گیا ہے. ایک حسرتناک ہنسی سے وہ غمنا ک
آہ کے ساتھ بولی . پھر ذرا دھیمے لہجے میں کہا ــ نبی ، ا
سوجا . کل مٹھائی کھانا .
ــ ماں وہ آدمی کہاں سے آیا تھا؟ نبی نے پھر پوچھا ــ ماں
تم نے اس کی پیٹھ پر دو ڈینے لگے دیکھے تھے ؟
ــ ڈینے ؟ اب تو حلیمہ کی عقل پرواز کر گئی . نیم روشن
اور نیم تاریکی میں وہ تیز تیز نظروں سے نبی کے چہرے کی طرف
دیکھنے لگی .
حلیمہ کچھ بھی ٹھیک نہ کر سکی .
نبی نے پھر کہا ــ ہاں، ڈینے ، خوبصورت جیسے مور کے
حلیمہ نے نبی کو اور قریب گود میں گھسیٹ لیا . اس
پیٹھ پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ــ نبی، وہ فرشتہ آیا تھا، فر
آج شب برات ہے نا ! فرشتہ ہر گھر پر آ کر لوگوں کی کھوج
لے رہا ہے . آج فرشتوں کی چھٹی کا دن ہے .
فرشتہ آیا تھا! نبی کے جسم پر سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے
بڑی پھرتی سے وہ بچھونے سے اٹھ کھڑا ہوا ــ آج کی رات بڑی اچ
ہے . پگھلی ہوئی چاندی جیسی چاندنی میں دھوئی یہ رات کی
جگمگ جگمگ کر رہی ہے. ساری زمین نور میں نہائی ہوئی
گھر پھرتے وقت اس نے ہر ہر مسجد میں مردوں اور بچوں کو ق
پاک کی تلاوت میں مشغول دیکھا ہے . رات زیادہ گزر چکی
پھر بھی شاہ صاحب کی مسجد سے میٹھے سروں میں تلاوت کی آ
آرہی ہے . آج قبرستان انسان کے ہجوم سے گنگنا رہی ہے. آج
جاگ رہے ہیں . کوئی بھی سو یا نہیں ہے . آج لوگ فرشتوں
مردوں کی روحوں سے ملاقات کریں گے . آج لوگ اپنی دکھ مص

اور تکلیف و راحت کی باتیں فرشتوں کی معرفت خدا تک پہنچائیں گے۔ آج جیسی نعمت پوری رات کو بس حلیمہ اور نبی ہی سو سو کے ضائع کر رہے ہیں۔ آج ان کے شکستہ جھونپڑے کے پاس سے فرشتہ گذر گیا اور ان کے دکھ درد اور جنم بھر کی پیاس سے ماری زندگی کے متعلق ایک بات بھی سن کے نہیں گیا۔ افسوس کہ اسے کچھ بھی نہ سنایا گیا۔

حلیمہ بتی ہاتھ میں لئے بچے کے جذبات اور خیالات کا اندازہ لگا رہی ہے۔ اس نے ایک مرتبہ کہا ــ کیوں، بھوک لگی ہے؟

بھات کھائے گا؟ نبی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اپنی بھوک کو بھی بالکل بھول گیا ہے۔ آس کا دل ایک شیریں مگر اندوہناک فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔

ــ فرشتے اللہ کے پاس خبریں لے جاتے ہیں۔ کیا کوئی فرشتہ اس کی بھی کوئی خبر لے گیا ہے؟ کیا وہ یہ جا کر نہ کہے گا کہ میں نے برات کی رات میں نبی اور حلیمہ کو دیکھا ہے ــ ماں تم نے فرشتے سے کچھ کہا ہے؟ نبی نے پھر پوچھا۔

حلیمہ کچھ نہ سمجھ سکی اور بالکل خاموش رہ گئی۔

ــ ہائے ہائے، وہ دروازے پر سے گیا اور ماں تم نے اس سے کچھ نہ کہا؟ نبی بڑا ہی غمگین ہو گیا ــ ماں تم نے مجھے کیوں نہ پکارا؟

حلیمہ اس کے دل کی جلن پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے کہا ــ ارے پاگل۔ فرشتہ ہماری باتیں کیوں سنے گا۔ وہ تو بڑے لوگوں کی کھوج خبر لینے کے لئے آیا تھا۔ وہ تو بس ہمارے دروازے کے پاس سے کسی بڑے آدمی کے گھر گیا ہے۔

نبی بہت دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے یک بیک سوال کیا ــ اماں ، تم نماز کیوں نہیں پڑھتی ہو ؟ اس کی آواز میں بڑا ہی مربیانہ انداز تھا ۔

نماز پڑھ کے کیا ہو گا! آس کی آواز میں بڑی حسرت بھری آداسی تھی ۔

ــ کیوں ! کیا ہو گا ! نبی ناراضی سے جل اٹھا ۔ ماں جو لوگ نماز پڑھتے ہیں انہیں کے گھروں میں فرشتے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کی باتیں سنتے ہیں ۔

ــ نہیں رے نہیں ، اب کی بار حلیمہ چیخ پڑی ــ اللہ تو بستر لگا کے سویا ہوا ہے ۔ وہ تو سونے روپے والی نماز ہی پسند کرتا ہے۔ غریبوں کی سیدھی سادی نمازیں وہ کیوں پسند کرے گا۔

اللہ کی عظمت کے تصور ہی سے نبی گھبرا اٹھا ــ تو کیا ہے ماں ، کنگال اور مسکین کے لئے کوئی بھروسہ نہیں ہے؟ ان کے پاس تو اتنا سونا روپیہ بھی نہیں ہے تو کیا ان کی آرزوئیں بھی خدا کے پاس نہیں پہنچائیں گے ؟ بات بھی تو ہے ، ماں، میں نے تو کسی غریب نمازی کو مالدار ہوتے نہیں دیکھا ۔ غریب غریب ہی رہتا ہے ۔ ان کا دکھ کون دور کرتا ہے ؟ تو کیا ماں، سونا روپا کی میٹھی آواز ہی سے خدا کی نیند ٹوٹتی ہے؟ کیا اسی وجہ سے مالدار اور زیادہ مالدار ہوجاتا ہے۔ ایک حصہ دے کے ستر حصہ پاتا ہے؟

مگر خدا نے تو سب ہی کو پیدا کیا ہے ۔ وہ کیوں یک طرفہ صرف مالداروں ہی پر اپنی رحمت خرچ کریں گے ؟ کیا ان کی آنکھوں میں کسی دن بھی غریبوں کے درد پر آنسوں کے دو قطرے نہیں آتے ؟ ماں، کیا غریب ان کی نیند توڑ نہیں سکتے ؟

نا امیدی کی تاریکی میں نبی کا دل ڈانوا ڈول ہورہا تھا ۔

دروازے کے پاس سے فرشتہ چلا گیا ہے ۔ اس کا رنگ شوخ آگ جیسا لہکتا ہوا ۔ اس کی پیٹھ پر مور کے پروں کی طرح رنگا رنگ قسم کے دو ڈینے بھی جڑے ہوئے تھے ۔ سارے جسم میں کیسی خوشبو کی باس تھی ۔ سفید ، تیز اور چمکدار تازی گھوڑا کمر ہلاتا فرشتے کو لئے جا رہا تھا ۔ کاش نبی اگر جاگتا ہوتا تو فرشتے کی راہ میں لیٹ جاتا اور منت و خشامد کرکے اس سے اپنی ساری دکھ بھری زندگی کی داستان بیان کردیتا ۔ وہ اپنے جسم میں جلنے والے خون کے نا تمام قصوں کو سنا دیتا ۔ اگر فرشتہ اس کی باتیں نہ سنتا تو وہ اس کے بازؤں کو پکڑ کے جھول جاتا اور خود بھی اس کے ساتھ اڑتا ہوا خدا کے پاس پہنچ جاتا ۔ اگر یوں اس کی نیند نہ ٹوٹتی تو وہ اپنی پوری طاقت سے چیخ چیخ کر اور نوچ نوچ کر اللہ کو نیند سے جگا دیتا ۔

مگر اس سے کیا ہوتا ؟ لیکن ہر چیز کی کنجی تو خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے ۔ اگر اس کی نیند نہ ٹوٹی تو نبی کے لئے خوش نصیبی کے محل کے دروازے کیسے کھلیں گے ؟ الٰہی کون کھول سکے گا؟

نبی بستر پر جا کے لیٹ گیا ۔ ملک کے نہ جانے کتنے معاملات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے ۔ حلیمہ نے بتی بجھادی اور نبی کے قریب ہی ٹیک لگادی ۔ لڑکا دونوں آنکھیں کھولے باہر کی طرف دیکھے جارہا ہے مگر حلیمہ کو یہ نظر ہی نہیں آتا ۔ ہاں اس کے سینے سے سینہ ملائے وہ اس اضطراب کو محسوس کر رہی ہے ۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے ایک بار کہا ــ نبی ، بہت رات جا چکی ہے ۔ اب سو رہ ۔

نبی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے اور اس کے

خیالات کا سلسلہ حیرانی کے ساتھ ایک اور راستے کی طرف جا رہا ہے۔ آسمان سے زمین تک اس قدر چاندنی ــ پھر بھی کتنا اندھیرا۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی اسی اندھیرے میں ڈوبتا جاتا ہے۔

دوسری صبح رات کا پانی بھات کھا کے نبی دکان پر کام کرنے گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ نہ جائے مگر حلیمہ نے اسے بہت تنبیہ اور تاکید کر کے بھیجا۔ حلیمہ نے کہا ــ نبی! تمہیں اپنی قسمت آپ ہی بنانی پڑے گی۔ خدا کے پاس درخواست بھیجنے سے کام نہیں چلے گا۔

نبی کئی اور لڑکوں کے ساتھ مل کر بیڑی بنا رہا ہے مگر اس کا دل بیل خانے کے آس پار نیل کانٹے سے گھری ہوئی سنسان جگہ پر اٹکا ہوا۔ دکان سے بھاگ کے اور لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر وہ روز ہی اپنے آپ خیالی پتنگ اڑایا کرتا ہے۔ اس کے سوا دنیا میں اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہے۔ دنیا سے چھپا کے یہ بچہ اپنے معصوم چھوٹے چھوٹے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا کرتا ہے۔ مگر ہاتھ آخر کتنا بلند ہوسکتا ہے۔ اب نبی نے ایک پتنگ نبالی ہے۔ اس پتنگ کے ذریعے اس نے نہ جانے کتنی بار اپنی عرضی عرش الٰہی تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ پتنگ بلند سے بلند تر اس نے اسی مقصد سے اڑائی ہے۔

نبی پیٹ میں درد کا بہانا کر کے دکان سے اٹھ جاتا ہے۔ آج وہ ایک لمحے کے لئے بھی نچلا نہیں بیٹھ سکا۔ محتاط اندازسے شام کو وہ گھر پہنچا۔ ماں گھر پر نہیں تھی اس لئے نبی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تین پتیلیاں تجسس تجسس کر کے دو آنہ پیسہ نکالا ــ اوہو، یہ دو آنہ پیسہ نہیں ہے۔ یہ تو سات راجا کا دھن ہے۔ پیسے مٹھی میں بند کر کے وہ نواب گنج کی

طرف دوڑ گیا . سوت خرید کر اب اس نے پھر دوڑنا شروع کیا . ایک نئی دریافت کے جوش میں آس کا دل اندر سے کانپ رہا تھا . جنگل کے اندر ایک شکستہ مسجد کے ایک سوراخ سے آس نے اپنی پتنگ اور لٹائی نکالی . یہ پتنگ ہی اسے روزانہ دکان اور کام سے غافل کرکے یہاں تک لاتی ہے . یہی پتنگ آسے دنیا کے حدود سے باہر نکال کے عرش الہی کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور سب معاملات میں نبی کے منہ سے پھول جھڑا کرتے ہیں مگر اس پتنگ کی بابت وہ ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہتا . یہی تو اس کا نہایت پوشیدہ کھیل ہے جس میں کوئی بھی شریک نہیں . آس کا خاص اپنا کھیل .

نبی ایک وقت پیل خانے کے اس پار نیل کانٹے سے گھری ہوئی خاموش اور سنسان جگہ چلا جایا کرتا ہے . آس نے پرانے سوت میں نیا سوت ملاکے پتنگ آسمان کی طرف آڑادی . پتنگ جس قدر آہستہ آہستہ بلند تر ہوتی جاتی اتنا ہی نبی کا چنچل دل بے قابو ہوجاتا اور خوشی کی لہریں بار بار اس کے چہرے پر آٹھتی نظر آتیں . آس نے سوچا کہ آج ضرور ہی عرش کے پاس یہ سوت باندھ کر وہ اسے اپنی طرف کھینچ سکے گا .

پتنگ آہستہ آہستہ چھوٹی نظر آنے لگی . آخر جب ہاتھ کا سوت ختم ہوگیا تو نبی کے دکھ کی حد نہ رہی . سوت تو ختم ہوگیا مگر پتنگ اب تک نظر آرہی ہے . خدا کیا اتنا قریب ہے؟ نہیں ایسا تو نہیں . انسانی نظر سے دور ، بہت دور وہ عرش پر سوئے ہوئے ہیں . اگر وہ اتنے ہی قریب ہوتے تو پھر انہیں آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا . ابھی اور سوت کی ضرورت ہے . بہت سوت . اسی قدر سوت کہ اس کی پتنگ کو بادلوں کے آس پار لے جاسکے .

بادلوں کے پار اور عرش کے نزدیک۔ مگر اس کے لئے بھی تو پیسوں کی ضرورت ہے۔ نبی کے پاس اتنے پیسے ہی کہاں ہیں۔ کہ اس قدر سوت خرید سکے۔ اگر یہ ہوسکتا تو اس کی بدحالی دور ہوجاتی۔ نبی آسمان کی طرف دیکھ کے اپنی بے بسی پر چیخ اٹھا۔ جب تک اسے پتنگ اڑانے کا شوق تھا اس نے ایک نشے کی صورت میں پتنگ اڑانے کا شوق پورا کیا۔ مگر آج جب اس پتنگ بازی کا اس نے ایک مقصد متعین کرلیا ہے تو اس کے لئے یہ کھیل بھی اپنی کشش کھو بیٹھا ہے۔

کچھ دیر تک پتنگ اڑانے کے بعد نبی گھر واپس آگیا۔ اس سوت سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی اور بہت سوت کی ضرورت ہے۔ تھوڑا ہاتھ بڑھا کر عرش کا پایہ پکڑنا ناممکن ہے۔ بڑی احتیاط سے وہ شکستہ مسجد کے اندھیرے گڈھے میں اپنی پتنگ چھپا کے رکھا کرتا ہے۔

وقت چلا جارہا ہے۔ گھر پر بھی پیسہ نہیں ہے۔ اگر وہ ماں سے پیسہ مانگنے جائے تو حلیمہ قمچیوں کی مار سے اس کی پیٹھ کی کھال ادھیڑ دے گی۔ آج جو وہ دو آنے پیسہ چوری کرکے لایا ہے اس کے لئے آج کیا سزا بھگتنی پڑے گی اسے کون جانے۔ پھر بھی نبی آج اپنی لالچ کو سنبھال نہ سکا۔ ازل کے لکھے کو بدلوانے کے لئے کچھ خرچ اور کچھ نقصان برداشت تو کرنا ہی پڑے گا۔ ماں کی عدم موجودگی میں نبی نے پیسے کی تلاش میں ہی ساری ہانڈیاں پتیلیاں، پھٹے پرانے کپڑوں کی گٹھریاں بلکہ سارا گھر ہی ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہاں کہیں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ پیسہ رہ بھی کیسے سکتا ہے؟ بھیک یا نوکری کے ذریعہ جو چند ٹھیکرے اسے مل جاتے ہیں اس سے وہ اپنا اور بچے کا پیٹ ہی پورا

نہیں کرسکتی اور اکثر انہیں نیم گرسنہ رہ کر رات گذارنی پڑتی ہے . تو پھر پیسہ کہاں سے جمع ہوسکتا ہے .

یک بیک نبی کے دل میں آیا کہ اسٹیشن جانے سے کچھ پیسہ شاید مل سکے . اس کے ہم عمر بچوں کو اس نے اکثر قلیوں کا کام کرتے دیکھا ہے. اب نبی کے لئے سوچنا بیکار تھا . وہ بھوک کے باوجود اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا . اسے بہت دیر تک بیٹھا رہنا پڑا. جب گاڑی آئی تو نبی کی حیرانی بڑھ گئی . کتنے قسم کے لوگ ، کتنے رنگ برنگ کے لباس . بکس ، بستر ، ٹوکری، پٹارا وغیرہ وغیرہ. مال و اسباب سے پلیٹ فارم بھر گیا . قلی ، قلی ، مزدور ، موٹیا کی آواز میں ساری آوازیں ڈوب کر رہ گئیں .

سب کو اپنی اپنی قسمت کا حصہ مل ہی گیا مگر نبی کی قسمت خراب تھی . موٹیا چائے ، قلی چاہئے کی آواز اس کے گلے سے نہ نکل سکی . طالب کی نیت سے ایک ڈبے کے سامنے اس کے دونوں ہاتھ اٹھنے کو اٹھ تو جاتے تھے مگر پھر نیچے گر پڑتے تھے اور وہ دوسرے ڈبے کی طرف بڑھ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں غم تھا. آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں . کسی نے اسے بھکاری سمجھ کے شرم دلائی اور نصیحت شروع کی اور بعض جدید قسم کے لوگوں نے گردن میں ہاتھ دے کے اسے دھکے دئے . بہر حال کہیں سے بھی اسے کچھ نہ مل سکا .

ٹرین چلی گئی. اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے اپنی بدنصیبی کے غم میں نبی کا دل ڈوبا جارہا ہے. اب نبی کو اپنا دکھ درد اور بڑا نظر آنے لگا . ماں بیٹا کبھی کبھی ایک وقت پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں پاتے تھے. کاش سال میں ایک بار بھی وہ کپڑا خرید سکتے. اس کا باپ سینکڑوں پیوندوں سے بھرا جو کپڑا چھوڑ کے مرا تھا اس

میں اور پیوندوں پر پیوند اور جوڑوں پر جوڑ لگا لگا کے وہ دونوں اب تک پہنتے آئے تھے۔ گھر کی شکستہ دیوار تو تقریباً ختم ہی ہوچکی ہے۔ بارش ہوتے ہی ٹین کے سوراخوں سے گھر میں اتنا پانی آکے بھر جاتا ہے کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں رہتی۔ ان کے دکھ درد کی آخر کوئی حد بھی ہے؟ اگر وہ خدا تک اپنے دلوں کی آواز پہنچا سکتے تو شاید اس کے غم کی رات سحر میں تبدیل ہوجاتی۔ مگر حلیمہ نماز نہیں پڑھتی اور نبی نے سورتیں اور رکعتیں سیکھنے کا کبھی موقع نہیں پایا۔ پھر اللہ تعالیٰ کیوں اس کی باتیں سنیں گے۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب دوسری ٹرین آئی تو نبی کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے ٹرین رکنے سے پہلے ہی زور زور سے چیخنا شروع کردیا — مجور، مجور، قلی، قلی۔ ٹرین رکنے پر ایک گھڑی والے ہاتھ کے اشارے پر نبی ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس بھلے آدمی نے ایک اٹیچی اور ایک ہولڈال دکھا کر پوچھا — ویٹنگ روم تک لیجا سکو گے؟

— کیوں نہیں لے جاسکوں گا۔ نبی نے اطمینان سے جواب دیا — آپ ہمارے سر پر اٹھا دیجئے۔

— کتنا لے گا؟ اس بھلے آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

— مجھے بہت پیسوں کی ضرورت ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نبی نے کہا — آپ کتنا دے سکیں گے؟

اس شریف آدمی نے تعجب خیز نظروں سے نبی کو دیکھ کر کہا — یہ تو عجیب لڑکا ہے۔ پھر کہا — اتنے پیسے کیا کرے گا؟

— واہ، کیا پیسے کا کچھ کام نہیں ہے؟ نبی نے رنجیدہ

انداز سے کہا ــ مجھے پتنگ کی ڈوری خریدنی ہے بہت ساری .

وہ بھلے آدمی اب کی بار تو بالکل ہی ہنس پڑے . انھوں نے ہولڈال تو نبی کے سر پر رکھا اور اٹیچی خود ہاتھ میں لئے ٹرین سے نیچے اتر آئے . انھوں نے نبی کو چار پیسے کی جگہ چار آنے دے کر کہا ــ جا ، اس کی بہت ڈور مل سکے گی .

نبی نے چونی ویٹنگ روم کی میز پر پھینک دی اور کہا ــ نہیں . میں نہیں لوں گا . ان چار آنوں سے میرا کیا بنے گا ؟ مجھے تو بہت سی ڈور چاہئے . اتنی کہ میری پتنگ آسمان کو چھو سکے

نبی کا مزاج دیکھ کے سب حیران رہ گئے . آس بھلے آدمی نے چونی ہاتھ میں لی اور کہا ــ اچھا بتا اگر تیری پتنگ آسمان کو چھولے تو تجھے کیا ملے گا ؟

کیوں ؟ میں عرش کے پائے میں پھنسا کے اسے کھینچوں گا . ایک مدھوشی اور جوش کے عالم میں جیسے آس لمحہ نبی کوئی بڑا آدمی بن گیا تھا . ــ کیا اللہ صرف آپ ہی لوگوں کی باتیں سنے گا ؟

اب تو سب ہی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے . فضا گویا ایک ہی حال پر تھم گئی . کسی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی . ایسا معلوم ہوا جیسے وفاداران حکومت کے سامنے باغیوں کے انقلابی نعرے اس بچے کی زبان سے ادا ہو رہے تھے . آس شریف آدمی نے اب جیب سے ایک اٹھنی نکالی اور کہا ــ اچھا اب تو ہو جائے گا .

نبی نے اٹھنی ہاتھوں میں لی اب شکر گذاری کے جذبے سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں . آس نے جذبات کی رو میں کہا ــ دیکھئے جب میرے پاس بھی بہت سے پیسے ہو جائیں گے آس

وقت آپ ہمارے گھر آئیے گا ۔ میں اس روز آپ کے دونوں جیب پیسوں سے بھر دوں گا ۔

نبی کی بات پر سبھی ہنس پڑے ۔ جنھوں نے اٹھنی دی تھی وہ تو ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئے ۔ نبی ان کی آج کی اس مہربانی کو نہ بھولے گا اور جب اس کے دن پھریں گے اس دن وہ ان کا قرض دونوں جیبوں میں پیسے بھر کر پورا کر دے گا ۔ انھوں نے ہنستے ہنستے ہی کہا ــ ہاں ، ہاں ، میں ضرور آؤں گا ۔ میں ہی نہیں اس روز ہم سب آئیں گے ۔

نبی نے یہ باتیں سننے کا انتظار نہ کیا ۔ وہ سیدھا چوک بازار کی طرف چلا گیا ۔ اس نے بہت سارا سوت خریدا اور پھر گھر لوٹ گیا ۔ اب شام ہو چکی تھی ۔ اس نے اپنی شکستہ مسجد میں جاکر سوت چھپا کے رکھ دیا جہاں اس کی پتنگ تھی ۔

حلیمہ بھیک کے چاولوں کو ابال رہی ہے ۔ درختوں کے نیچے سے اس نے گھاس پات جلانے کے لئے اکٹھا کر لیا ہے ۔ نبی کو دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کے پوچھا ــ کیوں رے ، اتنی دیر کہاں رہا !

ماں کے درد بھرے سوال سے نبی کو بہت خوشی ہوئی ۔ آج حلیمہ کا مزاج ٹھنڈا تھا ۔ شاید اسے اب تک یہ خبر نہیں کہ نبی نے پتیلیوں کو الٹ پلٹ کے پیسے چرائے تھے ۔ نبی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر کیا ــ ماں ، میں دوکان سے نکل کے اک ذرا گھومتا پھرتا آیا ہوں ۔ اس نے نرم لہجے میں ماں سے کہا ۔

چولھے میں گھاس پات دیتے دیتے حلیمہ کی پر سوز آواز آئی ــ دیکھ بیٹا ، دوکان سے بھاگنا نہیں ۔ جب تو کام سیکھ لے گا تو گھر میں بہت پیسے آئیں گے ۔ کام نہیں کرنے سے بھات کپڑا بھی

مہیا کرنا مشکل ہے۔ ہم دونوں ماں بیٹے کا بس یہی تو سہارا ہے۔
اب نبی کے منہ کی طرف دیکھ کے حلیمہ نے کہا ــ نبی ، تجھے بھوک نہیں لگی ہے ؟

ماں کے ان درد بھرے سوالوں میں نبی اپنی بھوک بھول گیا تھا ۔ اس کے سوا ایک طرف سوت خریدنے کی خوشی اور دوسری طرف ماں کی شفقت یہ دونوں مل کے نبی کے لئے ایک ناقابل بیان مسرت کا سامان فراہم کر چکے ہیں ۔ آس نے ہنس کے کہا ــ نہیں ماں ، مجھے بھوک نہیں لگی ہے ۔ دوپہر میں دوکان میں کھانا کھایا ہی تھا ۔

حلیمہ نے اضافہ کیا ــ ہاں بیٹا ، وہ اچھا ہے ۔ بھیک کا بھات جس قدر پیٹ میں نہ جائے اتنا ہی اچھا ہے ۔ اس بھات سے ماں بیٹے کو سکھ نہیں ملے گا ۔

بھات پک جانے پر حلیمہ اور نبی نے مگر وہی بھیک کا بھات کھا کے سیری محسوس کی ۔

دوسرے دن نبی صبح ہی صبح دکان جانے کے بہانے گھر سے نکل کھڑا ہوا ۔ آج ہوا بھی معتدل تھی اور نبی کے پاس سوت بھی بہت تھا ۔ آج وہ زمین پر رہ کے بھی اپنی عرضی آسمان تک پہنچا سکے گا ۔

نبی نے پہلے پتنگ کو سینے سے لگایا ۔ آس کا دل دھڑک رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ہی پتنگ آسمان کی طرف اڑی ۔ ہوا کے زور اور نبی کے سخت اشاروں سے ہلتی ناچتی اور کانپتی وہ پتنگ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اونچی، بہت اونچی۔ آج سوت ختم ہونے پر نہیں آنا ۔ پتنگ آہستہ آہستہ چھوٹی ہوتی جارہی ہے ۔ اب شاید پتنگ لامحدود فضا میں گم ہوجائے گی۔ جوش اور مسرت میں نبی کی

آنکھیں بڑی بڑی دکھائی دینے لگیں ۔ اس کے سینے سے سانس بڑی لمبی نکلنے لگی۔ ہونٹوں کا بندھن کھل گیا ہے اور اس کے سارے چہرے پر مسرت بھری ہنسی دوڑ رہی ہے ۔ پتنگ جس قدر ناچتی اسی قدر اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی بڑی چمک کے ساتھ ناچتی نظر آنے لگیں ۔

آخر نبی نے دیکھا کہ اب لٹائی کا گھومنا بند ہو گیا ۔ سوت ختم ہو گیا ۔ اس سنسان ، نیل کانٹے سے گھری ہوئی جگہ پر نبی کی دونوں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ۔ پتنگ اب تک نظروں کی حدیں نہ پار کر سکی تھی ۔

نبی نے پتنگ اتار لی ۔ اسے اور زیادہ سوت کی ضرورت ہے بہت زیادہ سوت. خدا نے نہ جانے کیوں اپنا آسن اس قدر بلند رکھ ہے ۔ یہ نبی کی سمجھ سے باہر ہے ۔ مگر آسن اس قدر بلند رکھنے سے کیا وہ مطمئن ہو کر عرش پر سو سکے گا ؟ کیا دنیا میں سوت کی کمی ہے اور اس کا عرش چھو یا نہ جاسکے گا ؟ کیا اس عرش کے پایوں میں سوت باندھ کے اسے ہلایا نہ جاسکے ؟ اس رکاوٹ کی وجہ سے نبی کا حوصلہ اور بڑھتا جارہا ہے ۔

ہمیشہ کی طرح پتنگ اور لٹائی مسجد کے گوشے میں چھپا کر آج وہ پھر اسٹیشن چلا گیا ۔ اسے پیسوں کی ضرورت ہے ۔ سوت خریدنے کے لئے پیسے چاہئے ۔ اتنے سوت جنہیں عرش کے پایوں میں باندھ کر وہ خدا کو نیچے اتار سکے ۔ انسانوں کی دنیا میں ۔ خاکی انسانوں کے بیچ میں ۔

آخر کار دو آنے سے زیادہ اسے نہ مل سکا ۔ اتنے پیسوں سے بھلا کتنا سوت خریدا جا سکے گا ؟

اسی طرح کئی دنوں تک نبی تھوڑے تھوڑے پیسے جمع

کرتا رہا ۔ آس نے ان پیسوں سے نیا سوت خریدا اور پرانے دھاگوں میں نئے دھاگے ملا کر اس نے پھر پتنگ آسمان کی جانب اڑائی ۔

بہت دنوں سے نبی نے بیل خانے کے اس پار کی سنسان مسجد والی جگہ کو اپنی جگہ بنا رکھا تھا ۔ اس سنسان اور خاموش فضا میں نبی کے غیر مفتوح حوصلے آسمان سے باتیں کرنے لگتے مگر جس وقت ہاتھ کا سوت ختم ہو جاتا ، لٹائی کا گھومنا رک جاتا اور چھوٹی ، بہت چھوٹی ہو کر بھی پتنگ نظروں سے اوجھل نہ ہو سکتی اس وقت نبی کے دکھ درد اور غم و الم کو کون دیکھ سکتا ۔ لیکن وہ دل شکستہ نہ ہوا ۔ کامیابی سے قربت کا تصور اسے اور زیادہ با حوصلہ اور ضدی بنا دیتا ۔

نبی روز ہی دوکان کا بہانہ کر کے گھر سے نکل جاتا ہے مگر کہاں دکان اور کہاں نبی ۔ اسٹیشن اور بازار میں مزدوری کر کے جو چند پیسے اسے مل جاتے ہیں ان سے اپنے پتنگ کے لئے سوت خریدتا ہے اور اس کی لٹائی پر سوت زیادہ سے زیادہ موٹا ہوتا جاتا ہے

ایک دن واقعی اس کا پتنگ چھوٹا ہوتے ہوتے ایک سیاہ نقطے جیسا بن گیا اور پھر لا محدود دنیا میں غائب ہو گیا ۔ نبی ڈور کو پکڑے ہوئے آسمان کی طرف نظریں جمائے دیکھ رہا ہے ۔ آس کا بند بند کانپ رہا ہے ۔ فرط جوش سے آس کی پیشانی سے پسینے چھوٹ پڑا ۔ شکوک اور اوہام کی دنیا آباد ہو گئی ۔ ایسا لگنے لگا جیسے اب آس کا دم بند ہو جائے گا ۔ اس کا چہرہ ایک حسرتناک ہنسی سے چمک اٹھا ۔ جیسے آج آسمان اور زمین میں کشمکش شروع ہو گئی ہے ۔ اب کون ہارے اور کون جیتے ۔ اسے اپنے ہونٹوں کی ڈوری میں آسے کی کشش محسوس ہو رہی ہے ۔ ایک ڈور آسمان کی کشش سے ٹن ٹن کر رہی ہے ۔ کون جانے حد نظر سے پار رہ کر اس

ڈوری کو کون کھینچ رہا ہے ۔ لیکن اس کشش کی وجہ سے نبی کے ہاتھوں کی رگیں پھول اٹھی ہیں ۔

ڈوری کو ہلاتے ہلاتے نبی کی غمناک آنکھیں دکھنے لگیں۔ آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نبی اپنی پتنگ کی ڈوری کو لپیٹے ہی گا نہیں ۔ وہ کہتا ۔ آج لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کے پتنگ جدھر چاہے گھومتی رہے ۔ اس کی اپنی مرضی ، اس کا اپنا من ۔ ممکن کہ اسی طرح عرش کے پائے میں اس پتنگ کا ڈور پھنس جائے ۔ ابھی تو ہاتھ میں اور مضبوط گرفت کی ضرورت ہوگی۔ اسی ڈوری کے ذریعہ تو اسے عرش کو حرکت میں لانا ہے ۔ آج وہ بھی خوف اور حیرت سے آنکھیں ملتے ہوئے نیند سے آٹھ بیٹھیں گے اور خاکی انسان کی طرف دیکھیں گے۔ بلا خواہش بھی آج انہیں دکھی بندوں کی کہانی اور ان کی تاریخ سننا ہی پڑے گا ۔

نبی کی نگاہیں اوپر کی طرف لگی ہوئی ہیں ۔ صرف ایک ڈور پل صراط کی طرح بہشت تک جانے کی سیڑھی بنی ہوئی ہے ۔ یہ سیڑھی دنیا سے جنت تک چلی گئی ہے ۔ بیچ بیچ میں سفید ، سیاہ اور دوسرے رنگ کے ابر آ جا رہے ہیں اور ہوا کے دباؤ سے پتنگ کی ڈور جھن جھن کر رہی ہے ۔ ابر کے دو ٹکڑے اس ڈور کے سرے پر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ نبی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں ۔ اللہ کا عرش ٹھیک کہاں پر ہے اس سے وہ ناواقف ہے ۔ اسے معلوم نہیں پھر بھی آج اس کا دل کہتا ہے کہ آج اس نے اپنی بغاوت کا جھنڈا عرش کے قریب ہی کہیں نہ کہیں گاڑ دیا ہے ۔ ایسی جگہ جو عرش سے بہت دور نہیں ہے ۔

پیٹ کی بھوک ، ماں اور سنسار کی یاد اس وقت نبی کے دماغ سے باہر ہے ۔ وہ شام کے بعد بھی دیر تک ڈور پکڑے کھڑا

رہا. کہاں؟ پتنگ تو کہیں بھی اٹکی نہیں. آخر ایک بار آس نے سوت لپیٹ کر پتنگ نیچے اتار لی اور زمیں پر گرنے سے پہلے ہی اسے اس نے اپنے سنے سے لگایا. آس نے سر جھکا کے اس پتنگ کو سلام کیا. اسے اس پتنگ میں ایک عجیب طرح کی مہک محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ کچھ نم نم سی ہے. نبی کے دل میں خوشی کا طوفان امڈ آیا. آہ، شاید آج بہت دنوں کے بعد خدا اپنے غریب بندوں کے حال پر رویا ہے. یہ نمی آسی کے آنسوؤں کی معلوم ہوتی ہے. نبی کی پتنگ خدا کے آنسوؤں سے تر ہو گئی ہے.

اب اور عرش کا پایہ پھنسا کر اسے کھینچنا نہیں پڑے گا. عرش کو حرکت میں لانے سے پہلے خدا اپنے بندوں کے دکھ درد پر رو پڑا ہے. آج نبی واقعی طور پر اپنے آپ کو فاتح محسوس کر رہا ہے. وہ آج اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا ہے. آج سے ان کے لئے اور کوئی دکھ کی بات باقی نہ رہے گی.

گھر واپس آ کے نبی نے دیکھا کہ حلیمہ بستر پر تڑپ رہی ہے. اسے بخار آ گیا ہے. وہ ظہر کے وقت ہی گھر چلی آئی تھی. آج آس کی قسمت کا ایک دانہ بھی اسے نہ مل سکا. نبی کا دل ٹوٹ گیا. اگر خدا اپنے بندوں کے دکھ درد پر روتا تو آج اس کی ماں کو بخار کیوں آتا؟ آج اس کے گھر میں بھات کا قحط کیوں ہوتا؟ پھر تو یہ خدا کے آنسوں نہ تھے. یہ شاید شیطان کا پیشاب تھا. شیطان نہیں چاہتا کہ انسانوں کے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں آسمان پر پہنچ سکیں.

نبی نے سمجھا ابھی اور بہت ڈور کی اسے ضرورت پڑے گی. آسمان کے سات طبق پار ہونے کے بعد تو عرش ملے. حلیمہ بخار لئے ہی صبح کو اٹھ پڑی تاکہ چند گھروں میں گھوم پھر کے نبی

کے لئے کچھ بٹور لانے۔ نبی نے کہا ــ ماں ، تم نہیں کھاؤ گی ؟
حلیمہ نے آہستہ آہستہ کہا ــ نہیں، تو کھا کر دوکان چلا جا۔
نبی نے بھات کی پیچ پی کے بھوک مٹائی۔ پھر اس نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا ــ ماں، تم فکر نہ کرو۔ اللہ ہم لوگوں پر بھی مہربانی کی نظر ڈالے گا۔ ہم زیادہ دن اس حال میں نہیں رہیں گے۔
حلیمہ نے نبی کی طرف دیکھا اور ایک افسردہ ہنسی ہنس دی۔ اس نے اور کچھ نہ کہا۔ نبی آہستہ آہستہ گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ نبی ایک دن بھی دوکان نہیں جاتا بلکہ بازار یا اسٹیشن پر مزدوری کرتا ہے اور پیل خانے کے اس پار پتنگ اڑاتا ہے۔
نبی مزدوری کر کر کے روزانہ تھوڑا سوت خریدتا ہے۔ وہ بلند سے بلند تر فضا میں اپنی بغاوت کا نشان بھیجتا رہتا ہے۔ نبی کسی طرح تھمتا ہی نہیں۔ جس کے نور کی تجلی سے سینا پہاڑ جل کے خاک ہو گیا تھا اسی کی طرف یہ چھوٹا سا حوصلہ مند بچہ اپنا ہاتھ بڑھا رہا۔
وہ جس قدر ڈور جوڑتا جاتا پتنگ اسی قدر بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ نبی کو کسی طرف اور چھور نہیں ملتا۔ اس قدر دور اتنے بلند اور اس درجہ نظروں سے اوجھل رہنے کی خدا کو کیا ضرورت ہے یہ بات نبی کی سمجھ سے باہر تھی۔
ایک دن نبی پتنگ اڑانے کے بعد شام کو واپس آ کے دیکھتا ہے کہ ماں بہت خوش بحال ہے۔ اس کے جسم پر نئی ساڑی ہے۔ بڑی شان سے پلیٹ اور پیالے میں بھات اور سالن لئے نبی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔
مدتوں کے بعد نبی نے پیٹ بھر بھات دیکھا ہے۔ آج اسے بھوک

بھی لگی ہے ۔ وہ سیدھا جا کے حلیمہ کے پاس بیٹھ گیا اور کھانے لگا ۔ کھاتے کھاتے اس نے ماں سے کہا ــ ماں ! یہ آج اتنا سب کہاں سے آیا ؟

آج بھی حلیمہ بخار میں مبتلا تھی مگر وہ نبی کو خوش خوش کھاتے اور سوال کرتے سن کے گویا بالکل تندرست ہوگئی ۔ اس نے آہستہ آہستہ کہا ــ کہا ، ٹولی کے زمیندار کی بیوی مرگئی تھی نا ۔ یہ آس کے فاتحہ کا کھانا آج آیا ہے ۔ آن لوگوں نے بہت کپڑے اور روپئے خیرات کئے ہیں ۔ دیکھ میں تیرے لئے ایک لنگی بھی مانگ لائی ہوں ۔ حلیمہ اٹھی اور اس نے ایک چھوٹی نئی لنگی نکال کے نبی کے ہاتھ میں دی ۔

تعجب سے نبی حیران رہ گیا۔ آس نے سوچا ــ آج شاید خدا نے واقعی اس کی طرف نظر کی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نیند آج ٹوٹ گئی ہے ۔ اس کے دل میں شکریہ کے جذبات نے مد و جزر پیدا کر دیا ۔ نبی نے چھلچھلاتی ہوئی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اور کہا ــ ماں ، میں نے کہا تھا نا کہ ہمارا یہ حال بہت دن تک نہ رہے گا ۔

حلیمہ نبی کی اس بات کی ہرگز کبھی تصدیق کرکے حوصلہ افزائی نہ کرتی مگر آج اسے ایسا کرنا پڑا ۔ اس نے گویا نبی کی آنکھوں میں اپنے روشن مستقبل کا نشان دیکھا ہے ۔

زمیندار کی خیرات کے پیسے اور چاول سے ان کے دن اچھے گذرے ۔ اب پھر آدھا پیٹ کھانا اور کبھی آپاس کر کے سو رہنا شروع ہوا ۔ نبی کا دل غم اور رنج سے ٹوٹ گیا ــ یہ کیا کھیل ہے ؟ یہ کیا بچوں کا تماشہ ہے جو بندوں کی زندگی کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے ؟ کیا ابھی تک ان کی آرزو خدا کے دربار تک

نہیں پہنچی ؟

نبی روز پتنگ اڑاتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے۔ کیا اتنی دور خدا کے عرش تک پہنچ جائے گی؟ اچھا اگر نہ ہی پہنچ سکے تو آخر فرشتے کس لئے ہیں . وہ اسے کیوں نہیں پہنچا دیتے ؟ ان کا تو یہی کام ہے . وہی تو انسانی دلوں کی آواز خدا تک پہنچاتے ہیں. اللہ کے پاس سے انسانوں کے پاس پیغام بھی تو وہی لاتے ہیں. یہ فرشتے آج کل اس قدر بے رحم کیوں ہوگئے ہیں؟ آخر وہ نبی کی پتنگ اللہ کے پاس کیوں نہیں لے جاتے ؟

وہ دن سوموار کا تھا . صبح ہی صبح بغیر کچھ کھائے پیئے نبی اپنی پتنگ اور لٹائی لے کے چپ چاپ باہر نکل گیا . وہ اپنی پرانی جگہ گیا وہی جو ناگ پھنی سے گھیری ہوئی تھی . نبی نے لٹائی میں پرانی سوت کے اوپر نئی ڈور چڑھادی . آج آسمان ابر آلود تھا . دھوپ کے عکس سے ابر سفید دکھائی دیتے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں نیلا آسمان چمک رہا ہے. ایسے وقت میں نبی نے اپنی پتنگ آسمان کی طرف آزادی . اب اس کی لٹائی کھلتی جا رہی ہے اور پتنگ فضا میں شن شن پرواز کرتی بلند سے بلند ہوتی جارہی ہے . نبی ٹکٹکی باندھے پتنگ کی طرف دیکھ رہا ہے. جس قدر ڈور پر کھنچاؤ محسوس ہوتا ہے اس قدر نبی کا سارا جسم جھن جھن کرتا ہے. بلاسبب اس کا دل جوش سے بھرا جارہا ہے. نبی کچھ بھی سمجھ نہیں سکتا کہ اس غیر معمولی کیفیت کا سبب کیا ہے . اس دل جوش اور حوصلے کے زور سے تھر تھر کانپ رہا ہے . تخیل میں اس کے تصورات کے ڈینے سونے کے گدھ سے مل کر آسمان تک پہنچ رہے ہیں .

پتنگ رفتہ رفتہ چھوٹی ہوتی گئی . نبی نے ایک مرتبہ بڑے

اچھنبے کے ساتھ دیکھا کہ اس کی پتنگ کے چاروں طرف ایک بہت بڑا پرندہ اڑتا اور گھومتا ہے ۔ کبھی کبھی یہ پرندہ ابر کے پروں میں روپوش ہوجاتا ہے اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس پتنگ کو اپنا محور بنا کے وہ اپنے بڑے بڑے ڈینوں کے ساتھ چاروں طرف گھوم رہا ہے ۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک مرتبہ پتنگ کی ڈور اس پرندے کے پروں میں پھنس بھی گئی ۔ نبی کے ہاتھوں نے جھٹکا محسوس کیا اور اس کا دل ایک انجان خوف سے لرز اٹھا ۔ وہ پرندہ اور بھی تیزی کے ساتھ پتنگ کے چاروں جانب اڑنے لگا ۔ ڈور بار بار پرندوں کے پروں اور جسم سے ٹکر رہی تھی ۔ آخر نبی نے محسوس کیا کہ ڈور ہلکی ہوکر زمین کی جانب گرنے لگی اور پتنگ اس پرندے کے ساتھ ساتھ اڑنے لگی ۔ نبی کا غرور آج سر بہ سجدہ تھا ۔ اس کی کلاہ افتخار زمین بوس تھی۔ اب اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی ڈور عرش کے پائے میں اٹکا کے اسے حرکت دے سکے ۔

تنہا سنسان جگہ پر نبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ دونوں آنکھوں میں آنسوں بھرے وہ بار بار پتنگ کی طرف دیکھتا۔ ایک سیاہ نقطے کی طرح پرندے کے پیچھے پیچھے پتنگ اڑ رہی تھی ۔ وہ چڑیا بھی بلندی کی طرف اٹھتی جارہی تھی ۔ نبی اچھنبے میں پڑگیا ۔ یہ کوئی چڑیا نہیں معلوم ہوتی۔ ضرور یہ کوئی فرشتہ ہے۔ یقیناً یہ جبریل ہیں جو پرندے کی صورت میں اس لئے آئے ہیں کہ پتنگ وہ خدا تک پہنچادیں ۔ اس نے آنکھیں مل ڈالیں، مگر اب شکر گذاری کے آنسوں نبی کے دونوں گالوں سے بہ بہ کو دامن میں جذب ہو رہے ہیں۔ اس کے آنسؤں سے دھوئے ہوئے چہرے پر ایک دلکش ہنسی تھی ۔ اس میں درد اور مسرت دونوں ہی کی

آمیزش تھی ۔

اپنی بیوقوفی کی باتوں پر نبی کو خود شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ فرشتہ اتنے دنوں کے بعد اس کے دل کی آرزو خدا کے پاس تک پہنچانے کے لئے آیا ہے ۔ اس خیال سے کہ پرندہ اس کی پتنگ اڑا لے گیا وہ بے کار اسقدر گریہ و زاری کرتا رہا ۔ اب اسے اطمینان تھا اور وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا ۔ اب اس نے دیکھا نہ تو پرندہ ہی موجود تھا اور نہ پتنگ ، دونوں ہی غائب ــ بس سفید سفید ابر تھا یا بیچ بیچ میں چمکتا ہوا گہرا نیلا آسمان ۔ نبی بہت دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ اب پھر اس کی آنکھوں سے شکر گذاری کے آنسو گالوں پر ڈھلکنے لگے ۔ آج وہ کامیاب تھا۔ جبریل اس کی پتنگ لے گئے ہیں اور اب اس کی کتاب زندگی کا نیا ورق الٹے گا ۔

اب پھر ایک بار آسمان کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور گھر لوٹ گیا ۔ آج خوشی سے اس سارا جسم ناچ رہا تھا ۔ حلیمہ صحن میں بیٹھی ساگ کاٹ رہی تھی ۔ نبی چیخا ــ ماں ، ماں ، سنتی ہو ۔ اور کود کے اس کی گود میں جا گرا ۔

حلیمہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی اور پھر غصے سے ہونٹ چبا کر اس نے نبی کی گردن پکڑ لی ــ حرامزادہ ، تو کہاں سے آیا ہے آج تیری ساری شرارتیں باہر کئے بغیر میں دم نہ لوں گی ۔

نبی اپنی ماں کے غصے کا سبب سمجھ نہیں سکا مگر پھر بھی اپنی مسرت کی خبر وہ ماں کو سنانے کے لئے وہ بے قرار ہے ــ ماں ، میں نے آج جبریل کو دیکھا ہے ــ ہماری خبر ۔۔۔۔

نبی اپنی باتیں ختم نہ کر سکا ۔ دھم دھمادھم حلیمہ کے گھونسے اس کی پیٹھ پر برسنے لگے ۔ مارتے مارتے ہی کہتی جارہی

ہے۔ ماں وہ دے گا اور ہم کھائیں گے بیٹھے بیٹھے کھائیں گے۔ جھاڑو مار جبریل کے منہ پر سیکڑوں بار۔

نبی چیخ اٹھا ۔ ماں، ماں خبردار گالی نہ دینا۔ ماں، گناہ ہو گا۔ اللہ میاں خفا ہو جائیں گے۔

حلیمہ کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس کی گالیوں کا فوارہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔ آخر لاچار ہو کے نبی نے ہاتھوں میں اپنے دانت پیوست کر دئے۔

اب تو حلیمہ کے جسم میں آگ ہی لگ گئی۔ بیڑی کی دکان کا مالک حلیمہ سے کہہ گیا تھا کہ نبی کسی دن دکان پر ہی نہیں جاتا اس لئے اسے کام سے الگ کر دیا گیا ہے۔ حلیمہ نے دکان دار ہی سے سنا ہے کہ نبی سارا سارا دن بس پتنگ اڑاتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی بازار اور اسٹیشن پر بھی اسے دیکھا جاتا ہے۔ حلیمہ یہ خبر پاتے ہی غصے سے بے قابو ہو گئی۔ ایسے نافرمان لڑکے کو کام میں لگانے سے کیا حاصل؟ اب حلیمہ نے چھڑی ہاتھوں میں لے سڑاک سڑاک لگانا شروع کیا ۔ پیٹھ، ہاتھ اور سر کو لہو لہان کر دیا ۔ حرامزادے تیری ہی بھلائی کے لئے تو میرے سر میں درد ہے۔ تو مجھے ہی دھوکا دیتا ہے۔ میں اگر مر جاؤں تو کیا جبریل خوانچوں میں بھر کر تیرے گھر پر بھات پہنچائیں گے؟

بے تحاشہ مار سے نبی کی پیٹھ جابجا پھٹ گئی۔ اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر حلیمہ کو بھی خون سے تر بتر کر دیا۔ آخر وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔

رات میں حلیمہ کو بخار آ گیا۔ نبی کبھی کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور آخر کچھ نہ کہہ کے گھر کے ایک کونے میں زمین ہی

پر لیٹ گیا . اس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا . لیٹے لیٹے وہ سر پٹک پٹک کے منہ پھلائے بس حلیمہ کو دیکھتا رہا .

پھر وہ کب سوگیا اسے خود بھی خبر نہ ہوئی .

نیند میں نبی نے خواب میں دیکھا ــ جبریل آس کی پتنگ لئے بدلیوں کے اندر سے گذرتے ہوئے آسمان کی طرف جارہے ہیں . پھر اس نیلے آسمان کے پٹ کھل گئے اور جبریل کے لئے ایک راستہ سا بن گیا . اب پھر بادلوں کے بیچ بیچ میں سے سفر شروع ہوا . پھر ایک آسمان میں شگاف ہو گیا. اسی طرح چھٹے آسمان میں داخل ہوتے ہی جبریل کے پروں میں آگ لگ گئی . پھر بھی جبریل نبی کی پتنگ لئے بلند ہوتے ہی جارہے ہیں. اب وہ ساتویں آسمان پر تھے کہ یکایک نور کا ایک بقعہ اوپر سے نازل ہوا جس نے نبی کی دونوں آنکھوں کو جھلسا دیا . اب وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا . اس لئے نیند ہی میں چلایا ــ ماں ، ارے ماں ، میری دونوں آنکھیں جل گئیں .

نبی آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا . شکستہ دیواروں کے سوراخ سے سورج کی تیز شعاعیں اس کے چہرے اور آنکھوں پر پڑ رہی تھیں .

شمس الدین ابو لکلام

موضع کام دیپ پور ضلع باری سال میں شمس الدین ابولکلام ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ باریسال ضلع اسکول، برج موہن کالج اور کلکتہ یونیورسٹی میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے شمس الدین ابوالکلام ادب کے دلدادہ اور خدمت ادب کے ایک نقیب تھے۔ بچپن ہی سے انہوں نے ' شیشو سوغات ' نامی رسالے میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ باریسال کے دیہاتی علاقے کی خاص زبان اس کے انداز ادا اور طرز تکلم پر مبنی افسانوں کی تحریر میں انہوں نے بڑی مہارت حاصل کی۔ اس انداز بیان میں خاص طور پر ان کا افسانہ ' کریانائر مانجھی، ۱۹۴۶ء میں جوگانتر میں شائع ہوا۔ اس افسانے نے ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں انکی پہلی افسانوں کی کتاب '' شہر بانو '' شائع ہوئی۔ شمس الدین ابوالکلام نے اپنی تحریرات میں عام طور پر دیہات کے کردار اور دیہاتی ہیرو اور ہیروئن ہی کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے دوسرے ناول اور افسانوں میں خاص طور پر '' پتھجانا نائی، کابلی موکھر اور پرو بھیریتی '' قابل ذکر کتابیں ہیں۔ انہوں نے مختلف اوقات میں صحافی، مدیر، ایکٹر، پروفیسر، ریڈیو کے کارکن اور ڈراما نویس کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ سردست وہ اٹلی میں سنیما کی صنعت میں مہارت حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔

پتہ جانا نامی (راہ جانی پہچانی نہیں)

ماڈل تلا کے غفور عرف گوہر علی تقریباً پاگلوں کی طرح ایک کدال لئے گاؤں کی واحد سڑک کو جگہ جگہ سے کھودے جارہے تھے۔

ان کے اس دیوانہ وار شغل کے پس منظر میں ایک تاریخ یا قصہ پوشیدہ ہے۔ اگر ذرا ہمدردانہ غور و خوض سے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اس کام کو ناروا نہ کہا جاسکے۔ ورنہ بھلا کیا سبب ہے جو سڑک تمام گاؤں والوں کی متحدہ کوشش سے سب کے آرام اور نفع کے لئے اور گاؤں کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھانے کے لئے تعمیر ہوئی تھی اور جس میں خود گوہر علی کی اپنی قربانی کو بھی دخل تھا یعنی اپنی حقیر زمین کی پونجی میں سے ایک بڑا حصہ اس سڑک کے لئے انہوں نے از خود چھوڑ دیا تھا وہی گوہر علی اب اسی سڑک کو تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

پچھلی جنگ عظیم کے قبل تک مشرقی پاکستان کے دور افتادہ جنوبی حصے میں جو دیہات بیرونی ممالک کے ساتھ تقریباً بے تعلق ہوتے ہوئے کلیتہ دور وسطائی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان میں سے ایک ماڈل تلا بھی تھا۔ اس ملک کی عظیم تاریخ میں حکومت

اور سلطنت کی شکست و ریخت بہت دفعہ واقع ہو چکی ہے۔ بہت دور شہر دہلی، یا ڈھاکہ اور مرشدآباد کے شاہی تخت پر بہتیری حکومتوں کا قیام اور زوال وجود میں آچکا ہے۔ مغلوں کا فتنہ، پرتگالیوں کا حملہ، برگیوں کا طوفان کتنی بار اور کتنی جگہ آندھیاں لا چکا ہے۔ لیکن ماڈل تلا کی زندگی میں ان سب نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ انگریزی تہذیب اور بھارت کے سناتن تمدن نے اصلاحی روپ میں کچھ تغیر ضرور پیدا کیا تھا لیکن اس لڑائی سے پہلے تک ماڈل تلا گاؤں میں ان کے اثرات بالکل نمایاں نہ ہو سکے۔

کم سے کم سڑک کی تعمیر سے پہلے تک ماڈل تلا خود اپنی ساختہ تہذیب ہی پر فخر کرتا ہوا زندہ تھا۔

آس وقت کے ماڈل تلا کا قصہ بس آج سننے والوں کے نزدیک ایک افسانہ ہی معلوم ہوگا۔ یہاں کی زمین سے جو زندگی وابستہ ہے وہ محنت اور بہادری کے افسانوں سے بھرپور ہے۔ بدنما فطرت کے ساتھ مقابلہ کر کے وہ لوگ کھیتوں میں فصلیں پیدا کرتے، ہوس رانیوں کے حقوق پر وہ زمانہ وسطیٰ کے ہتھیاروں سے سج کر مقابلے کی لڑائیاں کرتے۔ وہ یہی پسند کرتے کہ طاقت کے بل بوتے پر لڑکیاں حاصل کر کے شادی کریں۔ فرصت کے اوقات میں وہ گانے بجانے یا باہم مقابلے کر کے مسرتیں ظاہر کرتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرونی دنیا کے ساتھ ان کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ زندگی گذارنے کا ایک بالکل ہی مخصوص اور معروف دستور اور طریقہ ان میں رائج تھا۔

بیسویں صدی کی تاجرانہ تہذیب کے بعض نشانات سے انہوں نے بالکل اعراض بھی نہیں کیا تھا۔ . . . ہاں آہستہ آہستہ۔

ایک دن اسی گاؤں کا ایک نوخیز نوجوان کسی طرح بھول بھٹک کر باھر جا پڑا . یہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کا واقعہ ھے . وہ جب لوٹا تو اپنے ساتھ صرف دھن دولت ھی نہیں لایا بلکہ بظاھر ایک زیادہ ترقی یافتہ طرز زندگی اور تہذیب وہ اپنے تصورات کی دنیا کے ساتھ ساتھ لایا . حیرانی کے ساتھ ماڈل تلا کے باشندے آس کے گرد جمع ھو گئے .

آس نے کہا ــ آس ماڈل تلا کے جھیل اور تالاب ، اور بیش کھالی اور اڑیل خاں کے بھی آس پار راجہ جس کی کچہری میں ھم سال میں ایک بار لگان جمع کرنے جاتے ھیں آس سے بھی دور اور بھی ایک دیس ھے آس کا نام شہر ھے . آس دیس کے ساتھ اور اس دیس کی زندگی کے ساتھ واقفیت پیدا نہ کرنے سے اس گندے گاؤں اور غیر مہذب ماحول میں ذلیل طور پر زندگی گذارنا بالکل ھی لا حاصل ھے . انسان بننے کے لئے اور اچھی طرح زندگی بسر کرنے کے لئے آن شہروں اور بندرگاھوں سے تعلق قائم کرنا نہایت ضروری ھے .

اس سلسلے میں آس کی پہلی تجویز یہ ھوئی کہ تعلق قائم کرنے کی غرض سے سب سے پہلے ایک سڑک تعمیر ھونی چاھئے .

جناب علی حولدار نے آس روز یہ خواھش بھی ظاھر کی کہ آج سے آس کی مادر وطن ماڈل تلا کو ترقی دینا اور وھاں کے قلیل التعداد باشندوں کو مہذب بنانا ھی آس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ھو گا .

کوشش پیروی کر کے آس نے ضلع بورڈ سے اس سڑک کا ٹھیکہ بھی لے لیا . ماڈل تلا کے قلیل التعداد پرجوش نوجوان گاؤں کی ترقی یا خود اپنی ترقی کے کام میں عظیم ھمت اور حوصلے کے

ساتھ مشغول ہوگئے .

اس کام میں سب سے زیادہ مشکل گوہر علی جیسے غریب کاشتکاروں نے پیدا کی. سڑک کی تعمیر کے سلسلے میں ان لوگوں کی جو زمینیں ماری جائیں گی انہیں چھوڑنے کے لئے وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے . گوہر علی نے کہا — بس پانچ کڑا تو میری زمین ہے اس میں سے دو کڑا اگر سڑک کھالے تو میں کیا کھاؤں گا ؟

جناب علی نے جواب دیا — میاں اتنے دنوں بس کھیت کا دھان بیچ کے کھانا سیکھا . سڑک بننے دو تو دیکھنا کہ ترقی کی کتنی راہیں اور آمدنی کی کتنی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں . بس اس سڑک کو سڑک ہی نہ سمجھو یہ تو اس سے بہت بڑی چیز ہے . سب باتیں تو سمجھ بھی نہ سکو گے. بس یہ راستہ ایک نئی زندگی کا بھی راستہ ہے .

گوہر علی نے کیا سمجھا ایسے تو کیا کہئے بس یہ ہے کہ انکار اور اعتراض کی شدت میں ضرور کمی ہوگئی. اول تو یہ جناب علی جیسے دولت مند باحیثیت آدمی کی بات تھی دوسرے یہ کہ خواب کی طرح اس نے شہری زندگی کی جو باتیں سنی تھیں انہیں سن کر اس کا دل بھی اس وقت تعجب خیز امکانات سے معمور ہوگیا تھا. یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس سڑک کے ذریعہ زندگی کی نئی راہیں نہیں کھل سکیں گی . جناب علی کے گھر سے نکل کر ہی اس کی جس زمین کے اوپر سے مجوزہ سڑک جائے گی وہ اس پر آ کھڑا ہوا .

اس وقت بھی اگہن کے مہینے کے آخری دنوں میں بھی تقریباً ٹخنوں تک پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتا تھا . دھان پک رہا تھا اور اس کی بالیاں زمین کی طرف جھکی پڑی تھیں . ان کی اکثریت کیچڑ تک خم ہوچکی ہے . مجا جھیل کی زمین ! وہاں تو ایسا

ہونا ہی چاہئے کسی سال بھی اس کھیت کی فصل نے نفع بخش صورت نہیں دکھائی۔ پانی رک جانے سے تقریباً نصف سے زیادہ فصل برباد ہوجایا کرتی ہے۔ پھر بھی ایسے وقت میں اپنے موروثی کھیت کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے سوچا کہ آخر کبتک دو دو دھان جمع کر کے وہ زندگی گذارتا رہے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ نئی زندگی کا جو رخ آپ سے دکھایا گیا ہے اسی کو اب آزما کے دیکھے۔

جناب علی کی باتوں میں راحت اور فراغت کا احساس ہے۔ انسان ہو کے زندہ رہنا تو سبھی چاہتے ہیں اور سب کے ساتھ ممکن ہے کہ اس کی زندگی سنور جائے۔ بس اب تک جن اصولوں پر زندگی گذرتی رہی ہے ان اصولوں میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ کیا حرج ہے۔ ایک بار پھر دیکھ لینا چاہئے۔ جناب علی، دس سال پہلے اس کا باپ جان توڑ محنت کرنے کے بعد بھی دو مٹھی سکھ کا بھات فراہم نہ کر سکتا تھا مگر اسی کے لڑکے نے آج جبکہ راحت کی زندگی بسر کرنے کے لئے بہت دولت کمائی ہے تو کیا اسی کی طرح جسمانی طاقت اور ہمت رکھتے ہوئے اور لوگ حاصل نہ کر سکیں گے؟

اس نے گھر آ کے بیوی سے کہا — میں نے طے کر لیا ہے کہ راستے کے لئے زمین چھوڑ دوں گا۔

بیوی اگرچہ کم عمر تھی مگر اس میں عقل کی کمی نہ تھی۔ وہ بھات نکالتے یکایک چونک کر ٹھہر گئی اور اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ تو ہم کھائیں گے کیا؟

اتنی سب باتیں سوچنے سے کہیں دیس کا کام ہو سکتا ہے؟ جو کام سب کے سکھ کا ہوتا ہے اس کے لئے سب ہی کو کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ گوہر علی نے جناب علی کی سب باتیں بیوی کو

سنا ڈالیں.

بیوی نے پھر بھی ناراضی ظاہر کی اور کہا ــ میں تو نہیں سمجھتی کہ دیس اور دیس کا کام کسے کہتے ہیں. مولوی صاحب تو فرما گئے تھے کہ ہم لوگ بڑے مزے میں ہیں. میرا تو خیال ہے کہ راستہ واستہ بنا کے ادھر آدھر آنے جانے سے مصیبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھے ہی گی . انھوں نے اور بھی کہا تھا ان سب نئی باتیں کرنے والوں کا طور طریقہ اچھا نہیں ہے .

ــ چھوڑ ان سب کی باتیں . کوئی نیا کام شروع کرنے سے کچھ لوگ تو مخالفت کرتے ہی رہتے ہیں .

بیوی نے تب بھی کہا ــ اچھا میں نے سمجھا کہ یہ دیس کے نفع کا کام ہے . مگر یہ کیا ہمیں بھی کرنا مناسب ہے ؟ جس کے گھر میں کھانے پہننے کا سکھ ہے اسے کرنے دو . راستہ ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں کیا ملے گا .

گوہر علی نے کہا ــ آ ہاہاہاہا . عورت کی عقل ! جس کے پاس جو چیز نہیں ہے اس کو تو ہونے کی فکر ہے اور جس کے پاس ہے اسے کیا غرض پڑی ہے کہ فکر کرے. سب کے سکھ ہی میں تو ہم لوگوں کا بھی سکھ ہے .

پھر وہ ہاجرہ کو اس ٹیلے پر لے گیا جہاں اس کا کھیت تھا. اس نے جناب علی سے راستے کے بارے میں جو سب باتیں سنیں تھیں انھیں دوہرا ڈالیں . اس نے انگلی سے اشارہ کر کے افق کے وہ کنارے بھی دکھائے جہاں ابر کی جھالریں جھلک رہی تھیں اور نیلے آسمان کے نیچے دھوپ ان میں چمک پیدا کر رہی تھی. سبز میدان کے کناروں پر پلاس کے جنگل کی طرف اشارہ کر کے اس نے ایسا بتایا جیسے اس کے خواب کی دنیا اسی طرف کہیں گم ہو گئی ہے . منھ

سے وہ وہی باتیں دہراتا رہا جو اس نے جناب علی سے سنی تھیں۔ یہ کیا ہے، محض سڑک۔ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا راستہ۔ یہ سکھ اور ترقی کی راہ ہے۔

ہاجرہ نے اسی سڑک کو جہاں تک وہ دیکھ سکتی تھی بچھی ہوئی محسوس کیا۔ وہ دنیا کی وسعت جس قدر سمجھ سکتی تھی بس اس کے نزدیک وہی ترقی اور خوشحالی کی حد تھی۔ اتنے دنوں تک مصیبت کی جو زندگی انھوں نے گذاری تھی اس کے خلاف انمیں بغاوت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور ایک زیادہ ترقی یافتہ زندگی کی راہ میں ساری رکاوٹیں ختم ہوتی جارہی تھیں۔ آج ان میں اس قوت فیصلہ کا بھی فقدان تھا کہ یہ سڑک ان کی تمناؤں اور آرزؤں کو پوری بھی کر سکے گی یا نہیں۔ بس ایک اعتماد اور امید پر وہ جوش اور امنگوں سے بھر گئے ہیں۔ گوہر علی نے جناب علی کے مقابلے میں بیان حالات کے وقت مستقبل کی زندگی کے متعلق جو نقشہ کشی کی تھی اسے ہاجرہ جیسی ایک دیہاتی ناسمجھ لڑکی نے کسی قدر اعتماد اور کسی قدر بے اعتمادی کے ساتھ جب قبول کر لیا تو اس میں قوت فیصلہ باقی نہ رہی اور وہ مغلوب الحال ہو گئی۔ وہ بار بار گوہر علی کا ہاتھ پکڑ کے اسے دباتی اور کہتی

— سچ! واقعی!

— تم خود مستقبل میں دیکھ لوگی۔

لیکن مستقبل کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے بعض اوقات اس کا دل جیسے مشاہدہ کرنے لگتا۔ مگر عملی طور پر اس کی حدود کا احساس بڑا مشکل کام تھا۔ گوہر علی بھی اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔

بالاخر تمام رکاوٹیں اور ساری دشواریاں ختم ہوگئیں اور سڑک

کی تعمیر کا کام ختم تک پہنچا۔ جناب علی نے دو دو گائیں ذبح کر کے مزدوروں کی دعوت اور خاطر مدارات کی۔ اس کی دعوت میں گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگوں نے شرکت کی۔ رات کو گانے کا مقابلہ شروع ہوا اور یہ جلسہ رات بھر چلتا رہا۔ ایسی تقریب یہاں کی بے کیف زندگی میں بہت کم ہوئی تھی۔

مرد تقریباً سبھی ایک ایک کر کے شہر دیکھ آئے۔ ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی تحفہ آس مہذب دنیا کا لے کر لوٹا۔ ابتدائی جوش کم ہونے کے بعد لوگوں نے آس راستہ پر جانور باندھنا شروع کردیا۔ کھیتوں میں کام کرتے کرتے آس کے قریب بیٹھتے اور باتیں کرتے، حقہ پیتے۔ اسی اثنا میں گاؤں کے چار پانچ نوجوان قسمت آزمائی کے لئے گاؤں سے باہر بھی چلے گئے۔

گوہر علی بھی ایک مرتبہ اپنے سب کپڑوں کو ساتھ لئے، ہاتھ منہ پر تیل لگائے اور ایک تیل پرورده چمکدار لاٹھی ہاتھوں میں لے کر تین دن کے لئے شہر اور بندر گاہ گھوم پھر کر دیکھ آیا۔ آسے جناب علی کی باتوں کا اب کی دفعہ عینی مشاهده ہو گیا۔ سچ! یہاں کے لوگ واقعی نئے لوگ ہیں۔ یہ سکھ اور دولت سے مالامال ہیں۔ گویا یہ کوئی نئے قسم کے انسان ہیں۔ ان کا چال چلن ان کی باتیں اور ان کا طور طریقہ سب ہی گوہر علی کے نزدیک بے حد دلکش اور دل فریب تھا۔ تاہم یہ سب دیکھنے سننے کے باوجود ایک غم ہر وقت اس کے دل میں چبھن محسوس کرانے لگا کہ ان ہر بات میں کوئی خاص جدت نمایاں نہ تھی۔ آس جیسے غریبوں سے سب ہی متنفر تھے۔ کہیں کوئی کھڑا ہو کر ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھتا نہ دیکھا گیا۔ نہ یہ پوچھتا کہ تمہارا گھر کہاں اور تمہارا دیس کہاں ہے۔ آس کے ماڈل تلا میں انجانوں کے ساتھ بھی جو

یگانگت کا برتاؤ وہ دیکھتا آیا تھا آس کا یہاں کہیں پتہ نشان تک نہ تھا۔ یہاں تو کوئی آنکھیں اٹھا کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اگر کسی نے کبھی دیکھا بھی ہے تو گوھر علی نے آن آنکھوں میں بڑی بے مروتی اور ناخوش گواری محسوس کی ہے۔ ان آنکھوں میں نہ محبت تھی اور نہ دلکشی۔ ان میں یگانگت کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔ بس ایک تحقیر اور تذلیل کا تصور ھی ان سے میں نمایاں تھا۔ بس شام کو وہ بازار کے راستے سے گذرنے وقت مبہوت ہوگیا تھا۔ راستے کے دونوں طرف بے شمار عورتیں، کوئی اس کی طرف گول گول دیدوں گھور رہی تھی اور بعض نے تو اس پر اشاروں سے آوازے بھی کسے تھے۔ آس کی طرف ایک عورت کے اشارے پر جب ساری عورتیں ہنسنے لگیں تھیں تو گوھر علی پریشان ہوکر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ تاہم ایک عورت کی پرشوق نگاھیں آسے بڑی بھلی لگی تھیں۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر اسی راستے پر گیا۔ وہ لڑکی آس وقت بھی وھاں کھڑی تھی۔ گوھرعلی جب آس کے قریب سے گذرا تو وہ بڑی میٹھی ہنسی سے ہنسی۔ گوھر علی کا جیسے سر خراب ہوگیا۔ وہ منھ کھولے بڑی دیر تک نیم خیالی میں وھیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ عورت نے ھاتھ کے اشارے سے آسے قریب بلایا ــ آؤ۔

گوھر علی نے ایک محسور شخص کی طرح آس کے حکم کی تعمیل کی۔

لڑکی آسے ایک ایسے گھر میں لے گئی جو گول پتوں اور بانسوں سے بنا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک بستر تھا اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی لالٹین۔ لڑکی نے روشنی ذرا تیز کی اور اس کے قریب آ کے بیٹھ گئی۔

ــ گاؤں سے نئے نئے آئے ہو نا؟

گوھر علی نے سر ھلایا .

ــ خوب، ٹینٹ بھاری ھے تو ؟ دس روپئے سے کم میں کام نہ ھو گا . دیکھوں کتنا ھے . یہ کہہ کے اس نے گوھر علی کی کمر کو ھاتھ لگایا گوھر علی جس طرح مبہوت ھو گیا تھا اسی طرح خائف بھی تھا . اس نے اک ذرا رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس کے ناز و انداز میں کھو گیا .

بس پانچ منٹ ھی میں اس نے گوھر علی کا سب کچھ چھین کر اسے وھاں سے اٹھا دیا ــ اگر اور روپیہ ھو تو وہ لے کر آنا . یہاں سے ابھی جاؤ !

اس کے عوض گوھر علی کو کیا ملا اسے تو وھی سمجھے ، پھر بھی اس بیگانگی کے دیس میں اس نے اس عورت کے اشاروں میں جو یگانگت محسوس کی تھی اس کے ایسے برتاؤ نے گوھر علی کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا .

دل ھی دل میں اس نے محسوس کیا کہ یہاں پیسے ھی سے ھر چیز خریدی جاسکتی ھے . یہاں پیسہ ھی سب کچھ ھے . اسے بڑی تنہائی اور وحشت معلوم ھونے لگی . تیسرے دن صبح ھی کو وہ ایک شکستہ اور متنفر دل کے ساتھ اپنے گاؤں کے راستے پر ھولیا .

سارا راستہ وہ اسی فکر میں کاٹتا رھا کہ جب پیسہ ھی سب کچھ ھے تو پیسہ حاصل کر کے ھی مسرتیں خریدی جا سکتی ھیں اور مستقبل کی زندگی کو بنایا جا سکتا ھے . اب اسے پیسہ حاصل کرنے کی دھن تھی مگر پیسہ کیسے کمائے . اس تصور نے ھی اسے اور زیادہ پریشانی میں ڈال دیا . مجبور ھو کر اس نے سوچا کہ اس راہ میں کچھ کرنا آسان نہیں ھے

کوئی دوسرا کام آسے آتا ھی نہ تھا. اس لئے اس میں لگنا بھی سہل نہ تھا دل ھی دل میں نراس ھونے کے باوجود بیوی کے سامنے وہ ایک وقت جس بہادری کا اظہار کر چکا تھا اس کے لئے اس نے ھل چلانا نہ چھوڑا .

تنہا وھی نہیں بلکہ اور بھی پانچ آدمی یک رائے ھو کر سبزی ترکاری اور دوسری چیزیں بیچنے کے لئے وہ شہر کے راستے پر آتا جاتا رھا . جہاں سے جو چیز بھی ملتی آسے ھی زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا . مگر کوئی یہ نہ دیکھتا کہ شہر نے انہیں دیہاتوں کے پیسوں سے فروغ پایا ھے . اسی طرح رفتہ رفتہ گاؤں کے ھی لوگ شہر کی طرف جھکنے لگے . ھاجرہ نے ایک دن مذاق میں کہا ــ تم نے جو کام شروع کیا ھے کہیں ایسا نہ ھو کہ آخرکار ھمیں بھی بازار پہنچادو .

گوھر علی آس وقت اچھا پیسہ پیدا کر رھا تھا. دیکھتے ھی دیکھتے تین سال کے اندر اندر اس نے جھونپڑی کی جگہ ٹین کا نیا گھر بنا لیا . جن لوگوں نے جناب علی کی باتوں پر دھیان نہ دیا تھا اب ان کی بھی آنکھیں کھلنے لگیں .

مگر اسی سڑک پر اب آھستہ آھستہ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے لئے بھی لوگوں کی شہر سے آمد رفت شروع ھو گئی - سیدھی سادی آسان زندگی بدل کر اب پیچ پانچ اور بدفہمی کی زندگی شروع ھونے لگی . چالبازی اور جعل سازی . اس سڑک کے کنارے کنارے گلیاں اور راستے بھی بڑھنے لگے . بے شمار موڑ اور نہ جانے کتنی شاخیں . اب ماڈل تلا ایک بڑی جگہ بن گئی اور اس کے اثرات یہاں کے باشندوں پر بھی پڑنے لگے .

یہاں تک کہ اس سڑک پر محض اتنی سی بات پر کہ ایک

گائے نے کچھ دھان کھا لیا تھا دو جماعتوں میں جنگ اور آخر ایک خون تک ہو گیا .

جناب علی خبر پاکر دوڑتے دوڑتے جب آکر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ خون تو ہو ہی چکا ہے اس کی اتنی محنت کے پھل یعنی سڑک کے ایک حصے کو بھی نقصان پہنچ چکا ہے .

اس نے سب کو بلا کر کہا — کیا اسی لئے یہ سڑک بنائی گئی تھی . تم لوگ بالکل جاہلوں اور جانوروں جیسے ہو . جناب علی کے شور پکار پر بھی کسی کے چہرے پر کسی مسرت یا فکر کا نشان نظر نہ آیا . اس وقت تو انہیں تھانے اور عدالت ہی کی فکر پڑی ہوئی تھی .

اسی درمیان میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کی موجیں یہاں بھی آکے پہنچیں . اس دیس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا . حکومت اور سیاست کی بنا پر اس سے پہلے یہاں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی . لیکن ماضی کی صدیوں میں جو بات پیدا نہیں ہوئی تھی اور انگریزوں کے دو صد سالہ دور میں جو نہ ہوا تھا وہ اب ظاہر ہوا .

چاول دال کی قیمت بڑھی . سب چیزیں مہنگی ہوئیں . ہاں زندگی کی قیمت گھٹ گئی . آہستہ آہستہ اسی سڑک نے یہ سب کچھ وہاں پہنچا یا . بیماریاں آئیں . چور بازاری آئی اور بدحالی کا تیز دھارا جوار کی طرح چڑھ آیا . اس کے مقابلے میں جو کچھ نیو بیان تھیں وہ نہ جانے کہاں بہ گئیں .

عمدہ انتظام کے لئے جو سرکاری ملازم مقرر تھے وہ بھی اسی سڑک سے آتے جاتے تھے . وہ اسی راستے سے رشوتوں سے جیب بھر کر واپس جانے لگے . شہر میں صاحب کے باورچی خانے میں جو لطفو

کام کرتا ہے اس کے ساتھ اصغراللہ کی لڑکی فرار ہو گئی ۔ لڑائی سے واپس ہونے والے یوسف کی بیوی سخت قسم کے زنانے مرض میں مبتلا ہوکر اور سارے جسم میں زخموں کے نشان لے کر آخر دنیا سے رخصت ہوئی ۔ اب فوج کے ٹھیکے دار اور دلال سبزی ترکاری ، مرغی اور دوسری چیزیں خریدنے کے لئے آنے جانے لگے ۔

اتفاق کی بات کہ ان میں سے ایک کے ساتھ گوہر علی کی گاڑھی چھننے لگی ۔ اس وقت ہمدردی کا کال تھا اور گوہر علی بڑی تکلیف میں تھا۔ آس نے اس لئے دوستی کی کہ شاید اس کے ذریعہ سے کچھ روزی روزگار لگ جائے ۔

لیکن کام کچھ نہ بنا بلکہ ایک دن صبح ہی صبح نیند سے اٹھ کر گوہر علی نے ہاجرہ کو بھی گھر سے غائب پایا ۔ وہ دلال بھی لاپتہ تھا ۔ تلاش کرتے کرتے تقریباً سات میل کے فاصلے پر ایک کسان سے خبر ملی کہ آسی روز صبح ہی صبح اس نے ایک مرد کے ساتھ ایک عورت کو جاتے ہوئے دیکھا ہے ۔

مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر گوہر علی بیشتر حصہ گھر سے باہر گذارتا تھا اور اس کا یہ پھل ملا ۔ بے بس ہوکر آس نے دو دن گھر میں گذارے ۔ آس کے دل میں غصہ، غم اور دکھ بھرا ہوا تھا۔ اس کے دل میں افسوس تھا کہ انتقام کا جذبہ۔ اسے الفاظ نہ ملتے تھے۔ بس پاگلوں کی طرح اس نے ایک ہاتھ میں کدال سنبھالی اور سڑک کو جگہ جگہ سے کاٹنا شروع کر دیا ۔ وہیں پر جہاں آس کی زمین سڑک کے کام آئی تھی ۔

گاؤں میں شور مچ گیا کہ بیوی کے غم میں گوہر علی پاگل ہو گیا ہے ۔ یہ سن کے سب لوگ اسے دیکھنے کے لئے آئے ۔

گوہر علی اس وقت واقعی تھکن بھولا ہوا پاگلوں کی طرح

سڑک کاٹ رہا تھا ۔ گویا سڑک کاٹ کر پھر کھیت بنانے کے لئے وہ جان دینے پر آمادہ ہے ۔ وہ تنہا یہ کام کر بھی سکے گا یا نہیں اس کا اسے احساس تک نہیں ۔

سب نے پوچھا گوھر علی یہ کیا کر رہے ہو ؟

آس نے ہاتھ نہ روکتے ہوئے کہا ــ " توڑ رہا ہوں " ۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔

ــ کیوں ؟

غلطی ، غلطی ۔ یہ راستہ بنانا سخت غلطی تھی ۔ ہم نے جو راستہ چاہا تھا وہ یہ راستہ نہیں ہے ۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا ۔ کدال چلاتے چلاتے ہی گوھر علی یہ سب کچھ کہہ گیا ۔

سب کے دل میں آیا کہ یہ پوچھیں ــ کیسے بنانے سے ٹھیک ہوتا ؟ مگر گوھر علی کیوں ؟ وہ خود بھی اس کا جواب نہ دے سکتے تھے ؟ کسی اور سڑک کا خواب بھی تو کسی نے انہیں نہیں دکھایا تھا ؟

علاؤالدین آلازاد

ضلع ڈھاکہ کے موضع رام نگر میں ۱۹۳۲ء میں علاؤالدین آلازاد نے ولادت پائی۔ بچپن ہی میں والدین کے سائے سے محروم ہوکر علاؤالدین آلازاد نے بڑی محنت اور مصیبت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان حالات میں وہ زندگی کے مختلف مدد جزر سے باخبر ہوگئے۔ اسکول کی زندگی ہی سے انہوں نے ادبی کارناموں کی ابتدا کی - اسی کم عمری ہی میں ان تحریروں نے اپنی خصوصیات کی بنا پر ادیبوں کی توجہ حاصل کی - پروفیسری کی خدمات انجام دینے کے باوجود انہوں نے ادیبانہ خدمات سے پہلو تہی نہ کیا - ان کی تحریروں میں سب سے پہلے '' ابیگ '' نامی مضامین کی اشاعت ماہوار سوغات نے ۱۹۴۶ء میں کی - ۱۹۵۰ء میں ان کے افسانوں کی پہلی کتاب '' جیگے آچھی '' نے شائع ہوکر ادیبوں کی بزم میں علاؤالدین آلازاد کو طاقت ور صاحب قلم کا خطاب دلوایا - اس کے بعد انکی جو کتابیں افسانوں اور ناولوں کی صورت میں شائع ہوئیں انمیں '' وہان بنا ، اندھو کا سیڑھی، ۲۳ نمبر تیل چترو ، جگتیر شیش دات، بشنتیر پروتھم دن'' وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں - ان کی مشہور مضامین کا مجموعہ '' آم پاتا - جام پاتا '' اپنی قوت تحریر کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں - علاؤالدین آلازاد نے نثرونظم دونوں ہی میں اپنا کمال دکھایا ہے - اسی درمیان میں انہوں نے ایک نظم سائیکلون اور بچوں کے لئے افسانوں کی ایک کتاب ''مرکور جادوگر'' شائع کی ہے- سردست وہ سلہٹ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کے عہدے پر مامور ہیں -

برشٹی (بارش)

بارش ہوگی. خفیف شبنم سے منھ دھوئی ہوئی بہار کی رات میں دکھن سے جو ہوا چلے گی اس میں سمندر کی نمناکی ہوگی . پھٹی ہوئی خشک زمین اور پتی جھڑے ہوئے درختوں کی شاخوں پر نازک پتیاں اور شگوفے پھوٹیں گے اور دور دور کی پہاڑیوں کی چوٹیوں جیسی گھنی چھاؤں پیدا ہوگی . اس کے بعد گرج ہوگی ، بجلیاں چمکیں گی اور سارا آسمان لرزنے لگے گا. خوشی کے امرت کی طرح بے شمار دھاروں کی راہ سے بارش کا نزول ہوگا . درخت کی سوکھی شاخیں نئی کونپلوں سے آباد ہوں گی اور سارا میدان ہریالیوں سے سبزہ زار بن جائے گا. دوپہر کی دھوپ میں پٹسن کے پودے چننے میں سارے جسم سے جھر جھر کرکے پسینے ٹپکیں گے . مگر اس میں تھکن نہ ہوگی. کیونکہ نئی فصل کا پرمسرت خواب خون کے ہر ہر قطرے میں دوڑے گا .

مگر اس سال یہ سب کچھ نہ ہوا . پھاگن کا مہینہ گذر گیا مگر شمالی افق اک ذرا میلا تک نہ ہوا . چیت کا مہینہ بھی ختم ہو گیا . آسمان میں دو ایکبار ذرا ذراسی گڑ گڑاہٹ سنی گئی مگر ساری فضا محبوس سی ہو کر رہ گئی اور بس . اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوا .

اس کے بعد بیساکھ کا مہینہ آیا. اس وقت بھی سورج آگ کی لکیہ بنا ہوا اور بھی تیز ہوکر جلتا رہا . مٹی کی سطح سے اپنا سر بلند کر کے پٹسن کے پودے آہستہ آہستہ مرجھا گئے . اور پھر سوکھ کے رہ گئے . اوپر سنسان فضا اور نیچے دور دور تک ریگستان جیسا بنجر میدان اور اس کے نیچے جیسے شطرنج کی بساط، پھٹی پھٹی زمین جسے دھوپ کی تیزی نے جابجا شگاف دے کر ایک نقشے کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا. دوپہر کے وقت کھیتوں کی مینڈوں پر کھڑے ہونے سے کلیجہ پھٹ جاتا ہے . جیسے جھلسی ہوئی تانبے کی زمین اپنی پیاسی زبان باہر نکالے ایک ڈائن کی طرح منہ پھیلائے کھڑی ہے . وہ بھوک کی آگ میں جل کر خود اپنے بچوں یعنی پودوں کو نگلتی جارہی ہے . اس کا پھل اگلی سال ظاہر ہوگا . اللہ کا غضب ، اکال اور قحط ، خشک سالی اور بدحالی .

مگر ایسا کیوں ہے ؟ یقیناً اس کے پردے میں کوئی بڑا اہم سبب ہے. آس روز نماز جمعہ کے بعد اسی پر بحث ہوتی رہی. ممبر کے قریب کھڑے ہو کر مولانا محی الدین صاحب نے کہنا شروع کیا ــ برادران اسلام! میں ایک ناچیز بندہ ہوں. آپ لوگوں کی خدمت کیا عرض کروں . آپ لوگ سب کچھ خود ہی جانتے ہیں. کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا کا غضب اسی وقت نازل ہوتا ہے جب دنیا گناہوں سے بھر جاتی ہے . آج ہماری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟ بچے اپنے والدین کی باتیں نہیں سنتے ، عورتیں بے پردہ گھومتی ہیں ، چوری ، ڈکیتی اور بدمعاشی سے دنیا بھر گئی ہے . ادھر نہ نماز ہے نہ روزہ ، نہ زکوۃ ہے نہ حج ہے . چلئے ہم لوگ اس کے دربار میں زار زار گریہ و زاری کریں . کھلے میدان میں ہم ہاتھ

آٹھا کر مناجات کریں. وہ رحمان و رحیم ہے . وہ چاہیں تو اک ذرا مہربانی کر کے ہماری قسمتیں پلٹ سکتے ہیں .

مولانا صاحب کی تیز اور پرسوز آواز سے پختہ مسجد گونجنے لگی . مصلیوں میں سے حاجی کلیم اللہ آٹھ کھڑے ہوئے . منہ پر سفید داڑھی کا گچھا تھا اور سر پر کشتی ٹوپی . انھوں نے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا . پھر کانپتی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا — مولانا صاحب جو کچھ فرمائیں گے ہم یقیناً اس کی پیروی کریں گے .

مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات سب کو ذہن نشین کرنا ہوگا . کہ بدعملی کا انصاف ضروری ہے . یہ خشک سالی کیوں ہوئی ؟ کیا آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے ؟ اگر اس کی تشریح کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یقیناً کوئی عورت حرام کاری سے حاملہ ہوئی ہے . توبہ استغفراللہ . اسی قرب و جوار میں ، یہیں کہیں آس پاس میں ، کسی گاؤں میں ، ہمارے گاؤں میں بھی ہوسکتا ہے . اسے تلاش کر کے نکالنا ہوگا . ورنہ اس عذاب سے نجات ممکن نہ ہو سکے گی . ایسوں کو درہ مار کے ٹھنڈا کرنا پڑے گا .

حاجی کلیم اللہ نے جوش میں کانپتے کانپتے ایک مرتبہ داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے داڑھی میں خلال کیا اور پھر بیٹھ گئے . ان کے دماغ کی ہر ہر رگ میں قصور وار کو تلاش کرکے نکالنے کی فکر موجیں مار رہی تھی .

دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سارا میدان تپ رہا ہے. یہیں نماز استسقا پڑھی جائے گی . اس کے ایک دن پہلے ہی سے صوفی مولانا محی الدین بیمار پڑ گئے . گاؤں والوں نے درخواست کی کہ حاجی صاحب امامت فرمائیں. اول اول تو انھوں نے انکار کیا

مگر پھر سب کی درخواست پر راضی ہو گئے ۔

اس روز نماز ختم کر کے پورب منھ ہو کر حاجی کلیم اللہ کھڑے ہوئے ۔ بہت دور افق تک نگاہیں جما کے انہیں یہ دکھائی دیا کہ یہ دنیا ابھی بھی زندگی کے لئے بالکل ناکارہ نہیں ہوئی ہے آج بھی بلانے پر ہزاروں آدمی عالم الغیب کے دربار میں حاضری دینے کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں ۔ وہ کچھ دیر تک دیکھتے رہے انہیں ان گنت ٹوپیوں بھرے سر نظر آئے ۔ وہ میلی اور تیل سے چکٹ ضرور تھیں ، پھٹی اور ناکارہ بھی تھیں مگر تھیں تو ۔ تانبے جیسی تپتی ہوئی زمین پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ سبھی جیسے بیچارگی سے بس ذرا رحمت کی آس لگائے ۔ حاجی کلیم اللہ نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور بلند آواز سے فرمانے لگے ـــ یا اللہ ، اے بار خدا تو ذرا آنکھیں اٹھاکے دیکھ اور اپنے بندوں پر اک ذرا رحمت کر ۔ توہی آسمان و زمین، چاند اور سورج کا مالک ہے ۔ تیری انگلیوں کے اشاروں سے سمندر موجیں مارتا ہے ، ہوائیں چلتی ہیں ، نہریں بہتی ہیں ۔ تیرے اک ذرا اشارے سے یہ دنیا پھول پھل کے باغ و بہار بن سکتی ہے ۔ تو ہمیں ابر دے ، بارش دے ، سایہ دے ، شانتی دے ۔

اللہ ہم آمین اللہ ہم آمین ۔ ساری جماعت یک زبان ہو کر بولی حاجی ۔ کلیم اللہ کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی ۔ زار زار رو روکر انہوں نے دعا ختم کی ۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون ، و سلام علی المرسلین والحمدللہ رب ال عالمین ۔

اسی طرح ایک دن ، دودن، تین دن تک میدان میں جاکر جماعت میں بچے بوڑھے جوان سبھی شریک ہوتے ان کی ایک نگاہ آسمان پر تھی اور دوسری اپنی سوکھی ہوتی کھیتی والے کھیتوں پر

چھوٹے چھوٹے بچوں بچیوں نے ایک ماں اور ایک بچے کے جسم پر چونا اور سیاہی مل کے اور ان کے سروں پر کیلے کی جڑیں اور کٹیلے درخت کی شاخ رکھ کے کئی راتوں تک پانی کا تماشہ مچایا. ندی کے کنارے شیرینی کی نذر چڑھائی . کیلے کے پتوں پر فقیر فقرا کو کھانا کھلایا گیا . غرضیکہ سب جتن کئے گئے. اوپر دیکھتے دیکھتے گردنیں دکھ گئیں مگر وہی دھوپ کی تپش میں کوے کی آنکھوں جیسا نیلا آسمان گرمی کا اضافہ کرتا رہا اور ابر کا کوئی نام و نشان بھی نظر نہ آیا .

مغرب کی نماز کے بعد جائے نماز پر بیٹھے تسبیح پڑھتے پڑھتے حاجی کلیم اللہ یہی سب باتیں سوچتے رہے . ان کے دل میں بڑا غم تھا. واقعی بڑی دکھ درد کی بات بھی تھی. سوت کی چوربازاری کر کے انہوں نے کئی ہزار روپیہ کمایا تھا. جس کے نصف سے انہوں نے پدما ندی کے گھاٹ پر ایک گودام خریدا . خود پٹسن خرید کر نہ رکھنے سے گودام رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے. محض ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کرائے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا . اس سال بھی اس کی توقع نہیں ہے کہ خود پٹسن خرید سکیں گے. ادھر ساری زمین انہوں نے خود ہی کاشت کی ہے . یہ بھی ایک بڑی حماقت ہوئی ہے . اگر وہ اسے لگان پر اٹھا دیتے تو کم سے کم ڈیڑھ ہزار روپیہ تو کہیں نہیں گیا تھا . مگر خود کاشت کرنے کی وجہ سے مزدوروں، کھیت کی نگہداشت اور بیج وغیرہ پر بہت کافی روپیہ خرچ ہوا . مستقبل میں اور بھی خرچ سامنے ہے . لیکن آسمان کا جو حال ہے اسے دیکھتے ہوئے فصل پیدا ہونے ہی کی کیا توقع ہو سکتی ہے .

انہوں نے سوت کا کار و بار چھوڑنے میں بھی عقلمندی نہیں کی

پچھلے سال ہوائی جہاز پر جاکے وہ حج بھی کر آئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ حج سے واپسی پر اور زیادہ گھریلو جھمیلوں میں نہیں پڑیں گے۔ گودام لڑکوں کے حوالے کر کے خود زمین کی دیکھ بھال کریں گے اور بس۔ لیکن روپیہ کی کمی سے ہر منصوبہ خراب ہوگیا۔ حقیقت میں تجارت تجارت ہی ہے۔ اس میں سچائی اور غیر سچائی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اگر نیت ٹھیک ہے تو دان خیرات کرنے ہی سے سب درست ہوجاتا ہے۔

جنگلے کے باہر سے آم کے پھولوں کی تیز مہک آرہی ہے۔ بانس کے درختوں کے پاس بہت ساری مینائیں چہچہا رہی ہیں۔ حاجی کلیم اللہ کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے کھیل رہے ہیں۔ لیکن ان کا دل انہیں خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔

جیگون گھر میں روشنی جلانے آئی تو چونک پڑی۔ اس نے کہا ــ میاں صاحب یہاں ہیں۔ مسجد نہیں گئے۔

نہیں۔ طبیعت بہت اچھی نہیں ہے۔ حاجی صاحب نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کے کہا۔ اس کے علاوہ تیری مالکہ ماں بس غالباً ابھی آیا ہی چاہتی ہیں۔

تقریباً پندرہ دن پہلے نئی بیوی میکہ منانے باپ کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ حاجی صاحب خود نہ جاسکے اس لئے پہلی بیوی کے تیسرے بیٹے خالد کو انہیں لانے صبح ہی کو بھیج دیا تھا۔ دراصل انہیں یہ بالکل پسند نہ تھا کہ بیوی میکے جاکر رہے۔ انہوں نے پہلی بیوی کو بس زندگی میں دس دن باپ کے یہاں گذارنے دیا تھا۔ وہ بھی شروع شروع میں۔ دوسری بیوی کے موقعہ پر دنوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تھی۔ مگر اب عمر انحطاط پذیر تھی۔ ہر معاملے میں سختی دشوار تھی۔ دو سال پہلے دوسری بیوی کے انتقال پر اب

خانہ آبادی کی طرف سے وہ بالکل بیزار ہو چکے تھے۔ مگر خدا کی قدرت، بھلا کس کی مجال کہ اس سے کنارہ کش ہوسکے۔ انہوں نے قسمت میں جو کچھ لکھ رکھا ہے وہ سامنے آکے رہے گا۔ پچھلی بار جب وہ حج کے لئے عازم سفر ہو رہے تھے اس سے تقریباً ایک ماہ پہلے سب لوگوں نے انہیں مجبور کیا کہ ایسے بھرے پرے گھر کو ایک بیوی کے بغیر درست رکھنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ سونے کے گھر کو مٹی میں ملانا کیا معنی۔

لیکن بیوی؟ حاجی صاحب کی عمر تو ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ بھلا ایسی عمر میں کون اپنی بیٹی کو جنم جلی کرے گا:

ہنسایا حاجی صاحب، آپ نے ہنسایا! بھلا آپ کے لئے اور بیوی کی کمی؟ مجو پردھان نے داڑھی کھجاتے کھجاتے کہا ــ آپ کہئے تو کہ آپ شادی کیجئے گا۔ میں بیوی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ ہاں ایسی ویسی نہیں۔ میں ایسی لڑکی لادوں گا کہ آنکھیں ملتے رہجایئے گا۔

حاجی کلیم اللہ کی دونوں آنکھوں میں خوشی کے تارے ناچنے لگے۔ ایک انجان مسرت کی لہر سے ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیکن بظاہر وہ سنجیدہ بنے رہے۔ پچھلی رفیقہ حیات کی یاد اس قدر جلد بھلانا مناسب نہیں ہے۔ ذرا ٹھوک نگل کر وہ بولے ــ دیکھئے میری عمر کے تین جگ جاچکے۔ اب چوتھا جگ ہے۔ اب شوق اور ہوس کا زمانہ نہیں ہے۔ بس اب تو گھر کی دیکھ بھال اور اک ذرا میری خدمت یا فرمائش کی تکمیل۔ بس اسی قدر کافی ہے۔

مجو پردھان نے رازداری سے کہا ــ یہ تو میں نے سمجھا۔ بس ٹوٹا مال نہ ہو تو کام چلے گا اور بالکل نیا بھی نہ ہو تو حرج

نہیں . مگر یہ تو کہئے کہ چاہئے کیسا مال ؟ جسم و جان کو سکھ کس سے مل سکے گا ؟

اس کے بعد سات بیگھہ زمین کا قول و قرار کرنے کے بعد جو بیوی ٹھیک ہوئی وہ مجو پردھان کی اپنی نواسی تھی . عمر اکیس بائیس سال کی ہوگی . اس دیس کی لڑکیاں بس بیسی اور کھیسی ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے حاجی صاحب کے ساتھ یہ رشتہ بےجوڑ نہیں ہوا .

باورچی خانے کی دیگچیاں اور برتن رکھ سینت کے جیگون واپس آئی . وہ پوری تمکنت اور سنجیدگی سے ایک پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی. حاجی صاحب کا وظیفہ ابھی ختم نہ ہوا تھا . منھ کی بڑبڑاہٹ روک کے انھوں نے پوچھا ــ

ــ کیا ہے رے ، کچھ خبر ہے ؟

ــ ہاں ، ہے .

ــ کیا ہے ؟ بتاؤ . تسبیح کے دانوں پر انگلیاں رک گئیں . حاجی کلیم اللہ نے پرشوق انداز سے دیکھا . کاموں کے بہانے خفیہ خبر رسانی کی غرض سے انھوں نے جیگون کو بحال کیا تھا . یہی سبب تھا کہ وہ بڑے پرشوق انداز سے اسے دیکھنے لگے .

ــ میں آج تباشی کے پاس گئی تھی . میں نے دیکھا کہ وہ اپنے خصی کے لئے آم کے پتے توڑ رہی تھی . مجھے دیکھتے ہی وہ بہت ساری باتیں کہتی رہی . مگر میں اس کے جسم پر نظریں جمائے رہی . پھر دروازے کی طرف اس نے نظر ڈالی اور کہا کہ مجھے تو آس کا پیٹ کچھ بھاری بھاری نظر آرہا ہے .

حاجی صاحب نے متردد ہو کر پوچھا ــ اس کے شوہر کو مرے کتنے دن گذرے ہوں گے ؟

ــ سات آٹھ مہینے تو گذرے ہی ہوں گے ۔ مگر اسے چار پانچ مہینے کا حمل معلوم ہوتا ہے ۔

ــ ایسی بات ! تب تو بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ حاجی کلیم اللہ نے گویا سچائی اور حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں ۔ ان کی آنکھوں میں امید کی شعاعیں چمکتی نظر آئیں ۔

آہستہ سروں میں انہوں نے پھر دریافت کیا ــ اچھا وہ تباشی کے گھر میں جو آدمی رہتا ہے تم نے اسے بھی دیکھا تھا ؟

ــ ہاں دیکھا ۔ اس کی بیماری ابھی گئی نہیں ہے ۔ ہاں پہلے سے کسی قدر بہتر ہے ۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا وہ بستر پر سویا ہوا تھا ۔

ــ جو ہونا ہو سو ہو ۔ حاجی کلیم اللہ نے بے صبری کے ساتھ کہا ۔ سونے سے کیا ہوگا ؟ کیا یہ کام نہیں ہو سکتا ؟ ضرور ہو سکتا ہے ۔ تیرا کیا خیال ہے ؟

ــ ہاں آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے ۔ پھر تباشی کی چال ڈھال بھی تو ہم لوگوں کو پسند نہیں ہے ۔ رجب علی کی زندگی ہی میں لوگ نہ جانے کتنی باتیں اس کے بارے میں کہتے تھے ۔ نامانا پاڑے کے چھمو نے ایک بار اس کا دروازہ کھولا تھا ۔ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے ۔ رجب علی کو بھی اس کی اطلاع تھی ۔ اسی لئے چھمو پر سارا الزام آیا ۔ ورنہ عورت اگر خود نہ چاہے تو کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے ؟

اگر یہی ٹھیک ہو تو پھر کوئی بات ہی نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ تباشی ہی نے یہ کام کیا ہے ۔ ورنہ بارش کیوں نہ ہوگی ؟ حاجی صاحب نے پھر تسبیح گردانی شروع کردی ۔ کسی قدر وقفے کے بعد بولے ــ اچھا ٹھہر ، ذرا میں خرد بھی پرکھ لوں ۔ پھر کچھ

بندوبست کیا جائے گا۔

جیگون کے چلے جانے پر بھی حاجی کلیم اللہ بڑی فکروں میں پڑ گئے۔ ان کی پیشانی کی شکنیں اور بھی نمایاں ہو گئیں۔ تسبیح کے دانوں پر انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔ تباشی، تباشی، تباشی، تباشی کے سوا یہ کام اور کسی کا نہیں ہے۔ کم عمری میں شوہر مر جانے سے یہی ہوتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ شوہر کی صحبت کا مزہ جس نے چکھ لیا ہے وہ کیا اس مزے کو آسانی سے بھول سکتی ہے؟ یہ افیم جیسی چیز ہے۔ کھانا چھوڑا جاسکتا ہے مگر اس کا نشہ چھوڑا نہیں جاسکتا۔ پھر اس کی ابھی پوری جوانی ہے۔ ایسے ویسے دو ایک مرد اس کے لئے کیا ہیں۔ ایک آنکھ کے ذرا اشارے ہی میں وہ انہیں چت کرسکتی ہے۔ اس کی باتوں کا اندازہ بھی کیا ہے۔؟ ماموں زاد بھائی، دن میں مزدوری کرتا تھا مگر کالا آزار میں پھنس کر مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ بے دیکھے کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ باتوں سے کام نہیں چلتا۔ وہ دراصل اس کو اس لئے لائی ہے کہ ایک بستر پر رات گذار سکے۔ اس میں شک نہیں ہے۔

مگر اس کی کیا سزا ہو گی؟ اگر کتاب کا حکم مانا جائے تو گردن تک مٹی میں دفن کر کے اس وقت تک سنگسار کرنا ہوگا جب تک جان نہ نکل جائے۔ مگر آج کل کیا یہ ممکن ہے؟ تھانہ اور پولیس تو موجود ہی ہے۔ تب کیا تدبیر؟ جوتوں سے مارنا؟ ایک گھر میں مقید رکھنا؟ گاؤں سے نکال باہر کرنا؟

حاجی کلیم اللہ جس وقت ان خیالات میں گم تھے اسی وقت خالد اپنی نئی ماں کو ساتھ لئے مردہ گنگا ندی کے کنارے آ پہنچا۔ گھر سے روانگی کے بہت پہلے پورنیما کا چاند دکھائی دیا

تھا ۔ اب تو بانسوں کے سروں سے اونچا ہو کر اپنی نورانی کرنوں سے زمین پر چاندی بکھیر رہا ہے. چاروں طرف سکوت ۔ درخت اور پودے ہواؤں سے بے نیاز ۔ انہیں ہلنے سے کام نہیں ۔

مردہ ندی میں آج کل گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے ۔ دونوں طرف کیچڑ کے ساتھ جو پتلی پگڈنڈی خشکی کو ملاتی ہے اس کا بالو آہستہ آہستہ پانی کے بہاؤ میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے ۔ پانی کے اندر سے بورو دھان کے جو گچھے سر اٹھائے ہوئے ہیں ان میں دھان کی نئی اور نازک بالیاں لگ رہی ہیں ۔

جھک کر زہرا نے جوتے کا فیتہ داہنے ہاتھ سے کھول ڈالا ۔ اس کندھے پر چھوٹا بچہ ہے. اس کو دقت میں پا کے پیچھے سے خالد قریب آ کے بولا ــ ساجو کو مجھے دیدیجئے ۔ یہ دونوں تقریباً ہم عمر ہیں ۔ ابتداً خالد اسے آپ کہنے شرماتا تھا مگر اب وہ خیال نہیں ہے ۔

چاندنی میں دھوئے ہوئے جوان لڑکے کا چہرہ زہرہ نے غور سے دیکھا ۔ کھڑی کھڑی بھوں کے نیچے بڑی بڑی دو آنکھیں اسے بہت ہی بھلی معلوم ہوئیں۔ ایک ناقابل بیان احساس کی مواجی، جیسے کسی تاریک جنگل میں موج مارنے والی ندی ہلچل مچاتی ہے اسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی ۔ اس نے بڑے مدھ بھرے سروں میں پوچھا ــ تمہیں تکلیف تو نہ ہو گی ۔

خالد نے ہنس کر کہا ــ نہیں اس میں تکلیف کیسی ؟

ساجو کو پانچ برس کا چھوڑ کے اس کی ماں نے دو سال پہلے انتقال کیا تھا ۔ اس کی نگہداشت میں کمی کی وجہ سے اسے رونے کا مرض پیدا ہو گیا تھا ۔ اس نئی ماں کو وہ اتنا ہی پیارا لگا ہے کہ اب اسے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں کرتی ۔ زہرہ جب

میکے گئی تھی آس وقت بھی وہ ساتھ ہی گیا تھا .

دوسرے کندھے کے اوپر سے سوتے ہوئے چھوٹے بھائی کو اپنے کندھے پر لیتے وقت خالد کے دل میں آیا ، کبوتر کے دل کی طرح گرم اور مونی کی طرح نازک نہ جانے کس چیز کے ساتھ ایک لمحے کے لئے ہی سہی مگر اس کی بائیں ہاتھ کی انگلی اس طرح مس کر گئی جیسے ہوا میں ہلتی ہوئی کلی چھو جائے . فوراً آس کا سارا جسم اس طرح کانپ اٹھا جیسے ابر آلود آسمان میں کوندے کی لہر دوڑ جاتی ہے . ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک گلنار چہرہ ، رنگ سے بھرپور دکھائی دیا جس پر خون کی اچانک تیز تیز روانی بجلی سا عجیب کیفیت پیدا کر دیا تھا . خالد اور زیادہ کھڑا نہ رہ سکا . جیسے کسی دوسرے جنم کی ناصاف کوئی قریب کی مورت یادگار بن کر آس کی نظروں میں تیرنے لگی اور وہ ایک نامعلوم درد کی کیفیت محسوس کر کے منہ پھیر کر جھر جھر جھر جھر بہتے ہوئے پانی کے اوپر سے چلنے لگا .

مگر زہرہ کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی . آس نے کپڑے درست کئے اور سر اونچا کر کے چاندنی کی طرف ایک بار دیکھا اور پھر ایک بار آگے آگے چلنے والی مورت کو دیکھا . اس کے بعد وہ چنچل ہو پڑی . آس چاندی سے دھوئے ہوئے بالو میں جھرنے کی موج جیسے راستے پر ایک چنچل ہرنی کی طرح وہ گھٹنوں تک پانی کے قریب گئی مگر پھر وہیں ٹھہر گئی . دونوں ٹانگوں کے بیچ سے ساڑی کو سامنے کی طرف سمیٹ کر داہنے ہاتھ سے گھٹنے پکڑ کے چاندنی سے چمکتے ہوئے سیاہ پانی کی طرف زہرا نے سر جھکا کے دیکھا . آس کی شبیہ جیسے بہتی چلی جا رہی ہے . اسی کے ساتھ سانھ ہلکی ہلکی موجوں میں چاند بھی سمٹتا اور پھیلتا دکھائی

دے رہا ہے۔ یکایک سر اٹھا کر اس نے آواز دی ــ خالد!
خالد نے کچھ دور سے جواب دیا ــ کیا بات ہے؟
ــ مجھے چھوڑ کے چلے جارہے ہو؟ زہرا نے ایک خواب جیسی آواز میں کہا۔ مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ دیکھو دیکھو پانی کتنا حسین نظر آتا ہے۔
خالد پلٹ آیا اور کہا ــ کیوں آپ کو کیا ہوا؟ فرمائیے۔ ذرا جلدی چلئے۔ رات بھیگتی جارہی ہے۔
ــ ہاں ٹھیک ہے۔ رات تو بڑھتی جارہی ہے۔ اک ذرا پانی میں جاکر پھر زہرا ٹھہر گئی۔ اس نے پھسلتی ہوئی موجوں کی کی طرف دیکھ کے کہا ــ ایسے پانی میں مرنے میں بھی سکھ ہے۔
خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے آگے ہی بڑھنے لگا۔
آس پار نہ جانے کہاں ایک پرندہ بولتا جارہا ہے۔ "ہی ہی کہاں کہو"! ندی پار کر کے جب زہرا نے پیروں کو صاف کرکے نیا جوتا پہنا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں کچھ نہ تھا۔ اداس ہوا جیسے ایک خاموش میدان میں گھومتی گھومتی مرتی رہتی ہے آسی طرح اپنی باتیں سوچ کے وہ خوف سے لرز اٹھی۔ اس کا جسم جیسے جھنجھنا کر بے جان ہو گیا۔
خالد آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس نے سنا ــ ذرا ٹھیرو۔
ــ کیوں؟ پھر کیا ہوا آپ کو؟
ــ کیا معلوم؟ میں کچھ سمجھ نہیں پارہی ہوں۔ میری آنکھوں سے کیوں آنسو بہے جارہے ہیں؟ زہرہ نہایت بے چین ہو کر آگے بڑھی اور اس نے خالد کی نگاہوں پر اپنی دونوں اشک آلود نگاہیں گاڑ دیں۔ چاند کی چاندنی میں خالد نے دیکھا کہ اس کی دونوں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو برس رہے تھے۔

خالد نے پھر کہا ــ آپ کو کیا ہوا ؟

ــ کیا تم کچھ بھی نہیں جانتے ؟ کیا کچھ بھی نہیں سمجھتے ؟ ساڑی کے کھونٹ سے زہرا نے اپنی دونوں آنکھیں پونچھ کر بڑے بے کل کرنے والے انداز میں کہا۔ لاؤ ساجو کو مجھے دیدو۔ چلو، جلدی چلو۔ کوئی انسان نہیں ہے۔ مجھے بڑا خوف معلوم ہوتا ہے۔

وہ دونوں جب آمنے سامنے ہوئے تھے اس کے کچھ پہلے ہی سے تھوڑی تھوڑی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ اب اس وقت دکھن کی جانب سے ابر کا ایک چھوٹا ٹکڑا آڑتا آڑتا چلا آیا۔ کھڑاؤں پہن کر حاجی کلیم اللہ صحن میں ٹہل رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھ کے وہ چونک پڑے۔ تو ہو سکتا ہے کہ اس کا اندازہ صحیح ہو۔

" جیگون، او جیگون "۔ وہ ذرا ٹھہر کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ دیکھتی رہ ہمارا جو خیال ہے وہی صحیح ہے۔ آج آسمان پر ابر نظر آرہا ہے۔

جیگون چوکھٹ سے منہ بڑھا کے بولی ــ پھر بھی تو آپ ابھی اور پرکھنا ہی چاہتے ہیں۔ میرے دل میں کوئی شک شبہ نہیں ہے۔ تباشی تو بس ایک چھنال ہے۔

آسمان پر آڑنے والے ابر کو دیکھ کر حاجی صاحب پھر ٹہلنے لگے۔ اس کا کس طرح انصاف کیا جائے گا آس کا انہیں اور چھور نہیں ملتا۔

آدھ گھنٹے کے بعد زہرا جب آئی تو آن کے ساتھ سوتے سوتے باتیں کرتے کرتے بھی وہ گول کر گئی، مگر بہت رات تک آسے نیند نہ آئی۔

دل ٹھیک کر کے حاجی صاحب دوسری صبح تباشی کے یہاں گئے۔ پورب محلے میں آم کے باغ کے دوسرے کنارے بانس کے

گھر کے نیچے چولھے کے پاس وہ چاولوں کی کھدی کی ٹکیہ پکا رہی تھی . حاجی صاحب کی آواز سن کر ایک پیڑھا لئے صحن میں آئی . ایسے معزز آدمی تو سات جنم میں بھی اس کے گھر نہ آسکتے تھے . وہ کیسے ان کی خاطر مدارات کر سکے گی ؟ آس کا وہ اندازہ ھی نہ کر سکی .

سر پر آنچل ڈالے وہ کیا کہتی رھی اس کی جانب حاجی صاحب نے کوئی توجہ نہ کی . وہ تو پوشیدہ طور پر اپنی ترچھی نگاھوں سے آس کے سنہرے ملاحت آمیز جسم کے ایک ایک عضو کو ٹھونک بجا کر دیکھ رھے تھے .

ادھر گھر میں ناشتہ وغیرہ کا انتظام اور بندوبست ختم کر کے زھرا اپنی خواب گاہ میں چوکی کے ایک کنارے گم سم بیٹھی ھے .

شادی کے بعد ھی سے معلوم نہیں کسی جیسے ایک عجیب مصیبت میں پھنس کر اپنے فاضل اوقات کو وہ وہیں بیٹھ کر گذار دیا کرتی ھے . یہ کس کا جادو ھے ؟ کس کا منتر ؟ زھرا کی سمجھ میں نہیں آرھا ھے . گھر کا سارا حال ھر طرح بدلا ھوا نظر آرھا ھے مگر اس کمرے میں کوئی تبدیلی نہیں ھے. ھاں دن بدن نئی نئی چیزوں کا اضافہ ضرور ھوا ھے مگر پچھلی سوتن کا ابھی تک بہت سارا تازہ نشان موجود نظر آتا ھے. اندھیرے میں بیٹھے ھوئے آسے جیسے آس کے لبوں کی پھسپھساھٹ بھی محسوس ھوتی ھے . جب ایسا ھوتا ھے تو اسے یہ احساس ھونے لگتا ھے کہ اس کمرے میں رھنے کا اسے کوئی حق نہیں ھے اس نے تو ڈکیتی کی ھے کہ اس گھر پر اپنا اختیار چلا رہا ھے .

لیکن میرا کیا قصور ھے ؟ میں تو راضی نہ تھی. نانا نے کہا

کہ بیٹی مت رو . دو ایک سال صبر کر . اب یہ بوڑھا تو بس مرنے ھی والا ھے . اسے مرنے دے پھر دیکھ ایک جوان ساتھی تلاش کردوں گا. اس وقت جائداد پر قبضہ کر لے . زھرا نے دل ھی دل میں کہا ــ کیا خاک جائداد ھے .

تازہ زخم پر گرم ھوا کے جھونکوں سے جیسی جلن پیدا ھوتی ھے ویسی ھی جلن اسے اپنے سینے میں محسوس ھونے لگی . جیسے دم آھستہ آھستہ بند ھوتا جارھا ھے . ایک بار تو وہ واقعی چیخ اٹھی اس کی آنکھوں کے دونوں تاروں میں سے جیسے سیلاب امنڈ آیا ۔

سر چکر کھارھا تھا ۔ سر کے الجھے ھوئے بالوں کو درست کرکے زھرہ باھر نکل آئی ۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ھی اس کی نظر پڑی کنوئیں کے کنارے مہندی کے درخت کی جانب نم زمین سے سیرابی حاصل کرنے کی وجہ سے اب اس میں نئی کونپلیں پھوٹ رھی تھیں .

کتی روز ارادہ کر کے بھی وہ اس مہندی کے درخت کو کاٹ نہ سکی مگر آج داھنا ھاتھ سرسرانے لگا . تیز تیز قدموں سے وہ باورچی خانے میں جا گھسی. وھاں سے ایک دھاردار چھری لا کر وہ ایک ایک شاخ کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگی .

جیگون دوڑی آئی اور کہنے لگی ــ ھائے ھائے دلھن ، یہ کیا کر رھی ھو ؟ یہ درخت بہت دنوں کا ھے اور لوگوں کے بہت کام آتا ھے . میاں سننے سے بہت خفا ھوں گے .

ــ تو جا یہاں سے. کون غصہ کرے گا یا نہیں کرے گا اسے میں تجھ سے بہتر سمجھتی ھوں . میری خواھش ھے اس لئے میں کاٹ کے رھوں گی .

ــ میں کام کر کے کھاتی ہوں . میرا کیا ہے ؟ میں آپ ہی کی بھلائی کے لئے کہتی ہوں .

ــ زہرہ چینخی . کیا خوب ! میری بھلائی برائی کے بارے میں تجھے سوچنا نہیں پڑے گا . دنیا میں اور کوئی نہیں ہے ؟

جیگون کی ہمت نہ پڑی کہ مالک کی چہیتی بیوی کو کچھ اور کہہ سکے اس لئے اپنا چہرہ سیاہ کر کے اپنے کام میں لگ گئی .

زہرہ کچھ نہیں بتا سکتی کہ کیسے دوپہر ہوئی ، کیسے شام ہوئی یا کیسے رات نے آ کر سب کچھ اپنی سیاہ چادر میں ڈھانک لیا . بس آسے یہ محسوس ہوتا کہ ایک چمکدار اور تیز چھری سے کسی نے اس کے کلیجے کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا ہے . روزانہ کی سفید موجیں آسے منور نہ کر سکتیں . وہاں تو بس جیسے بھوسی کی آہستہ آہستہ جلتی ہوئی آگ اور اس کی گرمی .

عشا کی نماز کے بعد بستر پر سوتے ہوئے حاجی کلیم اللہ نے کہا ــ میں نے جو سوچا تھا وہی بات ٹھیک ہے . بتاشی ہی نے برا کام کیا ہے .

زہرہ نے پوچھا ــ آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟

ــ یہ سب معلوم کرنے میں کیا زیادہ عقل لگانی پڑتی ہے ؟ میں نے اک ذرا ذور کی ضرب لگائی اور وہ بج آٹھی . بس اور کوئی بات نہیں ہے. اگر فیصلہ کر دیا جائے تو بارش ضرور ہوگی.

حاجی صاحب اک ذرا خاموش رہ کے بولے ــ اگلے جمعہ کو بارہ بجے رات کے بعد میں انصاف کرنے کے لئے کمیٹی بٹھاؤں گا . دیکھیں کیا ہوتا ہے .

زہرہ چپ چاپ لیٹی ہوئی باہر کی طرف کان لگائے رہی . آم کے پھولوں کی خوشبو اسقدر مستی آور کیوں ہے ؟ رات اتنی سیاہ

اوو اندھیری کیوں ہے ؟ اگر سورج پھر سے طلوع نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا . سب کی نگاہوں سے اوجھل وہ ایسی جگہ جاکے چھپ جاتا جہاں آسے کوئی آنکھ نہ دیکھتی .

سر پر نرم و نازک ہاتھ کا مساس پاتے ہی حاجی کلیم اللہ خراٹے بھرنے لگے . اگر یہ آواز نہ ہوتی تو زہرہ یہ سمجھتی کہ ایک مردے کی آغوش میں سوئی ہوئی ہے جو سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ڈھنکا ہوا ہے. وہ نرم ہاتھ جسم سے الگ ہو گیا. پھر وہ بچھونے سے اٹھی. بڑی آہستگی سے اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور دبے پاؤں آموں کے درخت کی طرف چلی گئی .

تم سارا دن کہاں تھے ؟ خالد چپ حاپ رات گئے گھر کے اندر داخل ہوا تو زہرا نے اس سے دبی ہوئی آواز میں پوچھا — بے کھائے رہنا خوب اچھا لگتا ہے نا .

خالد نے جواب دینے کی کوشش بھی نہ کی اور گم سم رہ گیا. یکایک داہنا ہاتھ آٹھا کر اس کے گال پر ایک تھپڑ لگاتے ہوئے زہرا نے ذرا خفگی سے کہا — میں اب اور تکلیف سہہ نہ سکوں گی. تم گھر سے چلے جاؤ . چلے جاؤ .

کپڑے سے منہ چھپا کر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی برآمدے میں گئی اور گھر کے اندر جاکے کنڈی چڑھا دی .

خالد کھڑا کھڑا روتا رہا . اس کی دونوں آنکھوں سے جھرجھر کر کے آنسو نکلتا رہا اور گلا رندھ گیا . صبح سویرے اوروں کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر سے رخصت ہو چکا تھا. دریا کے کنارے کنارے کھیتوں کی مینڈوں پر وہ ٹہلتا رہا . اس کے بعد گھاٹ پر چلا گیا . اس کے دو بڑے بھائی وہاں کام کرتے ہیں. اسی گدی میں گیا . لیکن کہیں اس کا دل نہ جما . پھر نہ جانے کسی نامعلوم

کشش کی بنا پر وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔

جمعہ کو رات کے بارہ بجنے کے بعد ایک ایک کر کے سبھی مولانا محی الدین کی نشست گاہ میں جا موجود ہوئے۔ اس سے پہلے ہی کانا پھوسی کے ذریعہ حقیقت حال سے گاؤں کے سب لوگ باخبر ہو چکے تھے۔ لیکن سب لوگ تو فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں یہ صلاحیت کہاں تھی۔ آج کی مجلس میں صرف علماء اور سرداران محلہ جمع ہوئے تھے۔ آخر سب جنگلا دروازہ بند کر کے انھوں نے ملزم کو بیچ میں بٹھایا اور گفتگو شروع ہوئی۔

تین دن اور تین راتیں حدیثیں اور کتابیں پڑھ لکھ کے حاجی کلیم اللہ نے ایک فتولی تیار کیا تھا۔ مولانا کی اجازت سے انھوں نے آسے پڑھ کے سنایا۔

تباشی بہت پہلے ہی سر جھکائے گن گن کر رہی تھی۔ اب اس مرتبہ تو وہ داڑھیں مار کے رونے لگی۔ وہ چیخ چیخ کے کہنے لگی۔ — ہائے رے ماں، کیا یہ بھی میرے نصیب میں تھا؟ تونے پیٹ ہی میں نمک کھلا کے مجھے کیوں نہ مار ڈالا۔

"اے لڑکی اپنا رونا بند کر" حاجی صاحب نے ایک دھمکی دی۔ آس وقت تو بڑا مزہ آیا تھا نا؟

مولانا محی الدین بڑے متفکر معلوم ہوتے تھے ان کے باوقار چہرے پر متانت اور غمناکی کی آمیزش تھی۔ آہستہ آہستہ سر اٹھا کے انھوں نے بڑے سکون سے پوچھا کیوں رے، تجھے بھی کچھ کہنا ہے؟

کیا کہوں گی بابا۔ آپ لوگ تو غریب کی بات کا اعتبار کریں گے نہیں۔ ہم تو انسان ہی نہیں ہیں ورنہ مجھ پر اتنی بڑی تہمت کیا لگ سکتی تھی؟ ہم تو کتے بلی جیسے سمجھے جانے

ھیں ھماری بھلا عزت ھی کیا ھے ؟ اب تباشی نے آنکھیں پونچھ ڈالیں ۔

مگر یہ باتیں آسمان سے نہیں آتیں ؟ حاجی کلیم اللہ نے کہا یہ بات کسی اور کے نام سے نہیں کی گئی !

یہ میری قسمت کی برائی ھے . ورنہ ان کی موجودگی ھی میں کتنی بار مجھے ابکائیاں آئیں . کسی دن جلی مٹی اور املی کھائے بغیر نہ رھی . وہ رھتے تو کوئی کیا کہہ سکتا تھا .

ایک میلی چادر کندھوں سے لپیٹے بیٹھے بیٹھے بار بار کھانس رھا تھا تباشی کا ماموں زاد بھائی رحیم الدین. اس سے جب پوچھا گیا تو بس وہ بکر بکر دیکھتا ھی رہ گیا .

فیصلے کی باتیں ھو ھی رھی تھیں کہ آسمان پر کالے کالے ابر کے ٹکڑے ھر طرف سے گھر گھر کر آنے لگے . آسمان کا رنگ بدلنے لگا . چاند بار بار چھپتا اور نکلتا ھے . کھیتوں اور ندی پر کہیں چاندنی ھے اور کہیں سایہ . جیسے کہ فطرت " لوکوچوری" کا کھیل کھیل رھی ھے .

ایک بار تو ھوا بند ھو گئی . دیر تک ساری فضا گھمس کا شکار بنی رھی . بیچ بیچ میں گڑگڑاھٹ کی آواز سنی جانے لگی جس سے ھلکے پھلکے گھر کانپنے لگے . بجلیاں کوندنے لگیں . یہاں تک کہ گھر کے اندر پوری مجلس خوف زدہ ھوگئی .

ٹھیک اسی وقت میں حاجی صاحب کے گھر کے پچھواڑے ایک مورت جیسا سایہ آم کے درخت تلے کھڑا تھا . دبے پاؤں وہ کھلے ھوئے جنگلے کے پاس آ کر وہ دیر تک تفتیش کن نگاھوں سے دیکھتا رھا . گھر میں روشنی نہ تھی . گمنام خوف کے عالم میں جیسے کوئی پریت یا پری کا سارے گھر پر سایہ پڑ رھا ھے اور سارا گھر

ڈراونا ہو کر رہ گیا ہے۔ جنگلے کے پاس سے ہٹ کر یہ مورت گھر کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ باورچی خانے کے پاس سے گذر کر گھر کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ ایک ایک بار بجلی جب چمکتی ہے تو خوف سے کانپنے لگتی ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہوا چلنی شروع ہوئی۔ ابر کے ساتھ ساتھ گرج سے چاروں طرف ہلچل سی مچ گئی۔ دروازہ غالباً بند نہ تھا اس لئے تیز ہوا کے زور سے آواز کے ساتھ کھل گیا۔ وہ شخص آہستہ قدموں سے برآمدے میں آ کر کھڑا ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر مجبور ہو کر گھر میں داخل ہو گیا۔ اوپر نیچے بس آواز اور آواز۔ کارگٹ کی چھت ہوا کے زور سے جیسے چور چور ہو جائے گی۔ لکڑی کی دیواریں بھی دھپادھپ آوازیں کر رہی تھیں۔

بستر کے قریب آ کر وہ آدمی پس و پیش کرنے لگا۔ وہ کیا کرے گا اسے ٹھیک نہیں کر پا رہا ہے۔ جسم کے رونگٹے جیسے کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ دل دھڑک رہا ہے اور دماغ کا خون چنچنا رہا ہے خون کی روانی نے آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کہاں میں آپڑا یہ زندگی ہے یا موت؟ یہ خلا کس لئے؟ کیا سب کچھ کھو جانے کی علامت ہے یا ملنے کی رنگینی؟ اس نے کان لگا کے چوڑی کی جھنکار سنی۔ ایک گہری پرسکون سانس۔ کپڑوں میں ہلکی کسمساہٹ۔ گھر میں کیا آم کے پھولوں کی مست کرنے والی خوشبو آ رہی ہے یا کسی کے زلف مشکبار کی مہک ہے! نہیں نہیں، یہاں نہیں۔ یہ تو وہ نہیں چاہتی۔ چاہ بھی نہیں سکتی۔

قدم قدم وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایسے میں اسے محسوس

ہوا کہ ایک نرم نازک اور چاندی جیسے ہاتھ نے اس اندھیرے میں بلند ہو کر اس کے ہاتھ کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ آس وقت سارے آسمان پر ابر کی دھوم دھام، الٹ پلٹ اور آڑان ہو رہی ہے۔ کوندوں کی لپک سے ساری زمین لرزہ براندام ہے۔ تیز آندھی جیسی ہوا کے زور سے درختوں کی شاخیں جیسے تنے سے الگ ہوئی جارہی ہیں جنت اور دوزخ کو مخلوط کر کے جیسے ایک عظیم الشان اور قیامت خیز آواز میں خوفناک مگر حسین سرکا امتزاج ہو رہا ہے۔

اسی طرح کبتک آندھی چلتی رہی اسے کون بتا سکے۔ جب ہوا کم ہونے لگی تو پھر موتیوں جیسے قطرے لئے بارش اپنا روپ دکھانے لگی۔

تیز ہواؤں کے ساتھ جب پہلے پہل بارش ہوئی تو اس میں نئے موسم کی غضبناکی نمایاں تھی گھروں اور چھتوں کے اوپر سے بس کئی ایک چھپٹا آکر گذر گیا۔ مگر یہ حالت دیر پا نہ رہی۔ دھرپد کی سنگیت ہلکی پرلے کی طرح جب ہوا کے جھونکے مدھم ہوئے تو بارش نے اپنا زور دکھایا۔ اب بس رم جھم کی آواز باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح کتنا وقت گذر گیا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک مرتبہ کھلے دروازے کو عبور کر کے وہ شخص برآمدے میں آیا اور پھر برستے پانی میں صحن سے گذرتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے اتر جانب گھر کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے زہرا ملے دلے کپڑوں میں کمرے سے باہر نکلی اور برآمدے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ بارش کے چھینٹوں سے اس کا جسم بھیگنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد چھتری لگائے اور سر جھکائے حاجی

کلیم اللہ گھر میں داخل ہوئے انہیں دیکھتے ہی زہرا کہنے لگی۔ اتنی دیر کر کے ! مجھے تو بڑا خوف معلوم ہوتا ہے .

بواو میں کیا کروں. اس مصیبت کو ٹھکانے لگا آیا چھتری بیڑے پر ٹانگتے ہوئے حاجی صاحب نے فرمایا . وہ بڑی سخت حرام زادی ہے. آخر تک اس نے کسی طرح بھی اپنے قصور کا اعتراف نہ کیا. مگر کیا تباشی جیسی عورت کی مکر بازیوں کو بھی نہ سمجھ سکوں ! دونوں کو پچاس پچاس جوتے میں نے لگائے . مزید براں یہ کہ کل سے وہ گاؤں چھوڑ کے چلے جائیں گے . تم نے خدا کی رحمت دیکھی ! ساتھ ہی ساتھ بارش کا نزول ہوا .

ــ ہاں ، یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے. یہ بات کر کے زہرا جھم جھم برآمدے سے صحن میں کود پڑی اور پانی میں بھیگنے لگی . اس کا انگ انگ پر اسرار نظر آرہا تھا .

حاجی صاحب ہائے ہائے کرنے لگے . ارے ، ارے، یہ کیا کر رہی ہو ! کیا پاگل ہو گئی ہو ! اتنی رات کو تم بھیگ رہی ہو . اور سردی لگ جائے تو !

ــ نہیں ، مجھے کبھی سردی نہیں ہوتی . اب زہرا برآمدے کے قریب آ گئی . آنکھوں پر سے اس نے اپنے ہاتھ سے بالوں کا ایک گچھا پوچھے کو سرکایا اور پھر کھلے ہوئے پھول کی طرح اپنے حسین چہرے پر مدھر ہنسی بکھیرتے ہوئے بولی ــ آپ نہیں جانتے ! سال کی پہلی بارش میں بھیگنا بہت اچھی بات ہے . اس سے فصل اچھی ہوگی .

عبدالغفار چودھری

باریسال کے موضع اولائنیا میں ایک متوسط زمیندار خاندان میں عبدالغفار چودھری کی پیدائش ہوئی - نوعمر افسانہ نویسوں میں عبدالغفار چودھری کا نام بڑی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے - بڑی کم عمری ہی سے انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں افسانے لکھنے شروع کئے - ان کی سب سے پہلی افسانوں کی کتاب '' شمرا ٹھر چھوہی ، نے ممتاز ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کیا . ان کی دوسری تصانیف کا نام کمر شتو چھکو '' ہے ایک ادیب صحافی کی حیثیت سے وہ فی‌الحال ایک اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں

آدیم (پرانا)

ندی اور گاؤں پاس ہی پاس ہیں . الشا اب سونا کاندی ہے .
سونا کا ندی بہت پرانا گاؤں ہے. ہاٹ بازار مندر مسجد ، ہندو مسلمان، رعایا، جوتدار، زمیندار اور کارخانہ دار سبھی وہاں بستے ہیں . لیکن قریب سے بہنے والی تیز دھاروں والی ندی اب ندی کہلانے کی مستحق نہیں ہے . آہستہ آہستہ اونٹ کے کوہان کی طرح کچی مٹی کی تہہ جمتے جمتے ایک خشکی ظاہر ہوگئی ہے جو بڑھتی جارہی ہے . سبز گھاس کی تہہ کے نیچے نئی مٹی کی تہہ جمتی جارہی ہے . ندی مٹتی جارہی ہے. ہاں برسات میں الشا ندی اپنا پرانا روپ واپس پاتی ہے . دونوں کنارے کٹ کر شدید سیلابی صورت میں غضبناک مورتی کی طرح الشا اپنی سمندری موجوں سے سونا کاندی کو مٹا دینا چاہتی ہے .

ہر سال برسات میں متموج میگھنا کے سینوں پر ماہی گیروں کی کشتیوں پر رنگین بادبان اڑا کرتے ہیں . جوار کی شدید کشش بڑی بڑی کشتیوں کو الشا کی طرف کھینچ لایا کرتی ہے . برسات کے کے پانی میں سونا کاندی کی خشک ندی پر بھی کشتیوں کے بادبان لہرایا کرتے. بازار میں نئی مچھلیوں کا ڈھیر لگتا . "بے بج" کی عورتیں پٹھوں پر ساڑی کا آنچل باندھے اپنے جھولے میں بچوں کو

لٹکائے گھونگھٹ ہٹائے کھلے سروں پر مچھلیوں کا ٹوپا لئے گھر گھر مچھلیاں بیچتی پھرتی ۔ کبھی کبھی وہی اپنے بچوں کو پٹھوں پر باندھے کشتیوں کے کنارے بیٹھی پانی میں پیر لٹکائے تیز روی کے ساتھ دریا کے پیچ و خم میں وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتیں ۔ تندرست اور مضبوط جسم کی ایک ایک شکن تلوار کی باڑھ دکھایا کرتیں اور سونا کاندی کے بوڑھے خون میں طوفان اٹھنے لگتا۔

اب کی بار بھی لمبی لمبی کشتیاں آئیں۔ گھاٹ پر بندھی ہوئی ناؤ کی چھاؤنی سے ایک لڑکی نکل آئی ۔ سر پر ٹوپا اور عمر بیس بائیس سال کے لک بھگ لتا کے درخت کی طرح بل کھاتی ہوئی سرخ رنگ کی تانت کی ساڑی باندھے ایسی کہ دیکھنے والوں کو چونکا دے۔ صحتمند انگڑائیاں لیتی ہوئی جس سے جسم کی شادابی دوبالا ہورہی تھی بلکہ اور بھی کسی قدر فراوانی کے ساتھ پراسرار طور پر وہ اپنے چھریرے جسم کو بل دیتی ہوئی بلند و بالا ہوکر ایک پرسکون فوارے جیسی نظر آرہی تھی۔ ساتھ کا مرد ضعیفی کے انحطاط سے قریب تر ادھیڑ عمر کا ناڑ کے درخت کی طرح سخت، سیدھا اور درشت رو ۔

سونا کاندی کا منصور تعلقدار ان دونوں کو اپنے گھر پر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ والد حج کی تیاریاں کررہے تھے ۔ اور وہ خود ہی اپنی جائداد کا نگراں تھا ۔ اس کی سحر آفریں اٹھتی جوانی تھی اور بے فکری کی دولت کا دھارا فروانی سے بہ رہا تھا جس پر کسی کی روک ٹوک کا بندھن نہ تھا۔ ان دونوں کا اشتراک جسم کے خون کو تعلقہ دار خاندان کی خاندانی روایات دہرانے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر فرط اشتیاق سے اس کی دونوں آنکھیں چمکنے لگیں ۔ لیکن ساتھ کے مرد کو

ہمراہ دیکھ کر وہ دل کی باتیں زبان تک نہ لا سکا .

سر سے ٹوپا اتارتے ہی لڑکی نے ایک بہت بڑی سی مچھلی منصور کے پیروں کے پاس ڈالدی . منصور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے انتہائی دلاویز مگر مودبانہ انداز سے کہا۔حضور کی مہربانی . میرا نام لکھی ہے . میرا تعلق بے بوج قوم سے ہے . یہ میرا شوہر ہے . یہ کہتے کہتے اس نے اپنے ساتھی مرد کی طرف اشارہ کیا . اس کا نام جوگل چاند ہے . اس نے بھی اپنے درشت گلے کو بہت نرم کرتے ہوئے کہا۔ہم حضور کے گاؤں میں آئے ہیں اس لئے سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں. ہم مچھلی بیچ کے دن گذارتے ہیں . بڑے غریب ہیں اس لئے حضور کے لائق کوئی چیز پیش نہیں کرسکے .

منصور لکھی کو گھور کر نہ دیکھ سکا اس لئے اس نے دونوں پر نظر ڈالی اور کہا ۔ نہیں نہیں سلام کی کیا ضرورت . پھر لکھی کی طرف دیکھ کر کہا۔تم اس سے پہلے بھی شاید یہاں آچکی ہو ؟

لکھی کی چنچل آنکھیں کچھ دیر تک منصور کی مخمور اور سحر زدہ آنکھوں پر ناچتی رہیں مگر فوراً ہی نگاہیں جھکا کر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ نہیں، میں نہیں آئی. میری ماں بھانومتی آئی تھی. وہ کئی بار آپ لوگوں کے گھروں پر بھی آئی تھی . میں نے اس سے سونا کا ندی کے بہت قصے سنے ہیں. آپ نے اسے نہیں دیکھا ؟

منصور نے اپنے بچپن کی دیکھی ہوئی ایک صحتمند عورت اور اس کے چہرے کو یاد کرنے لگا. لکھی اسی کی ہم زاد نظر آئی. اس لئے پہلی ہی نظر میں وہ چونک پڑا تھا.

جوگول اور لکھی دونوں ہی نے اس دن ایک لمبا سلام

پیش کیا اور رخصت ہوئے .

دو دن کے بعد لکھی پھر آئی، سر کے ٹوپے میں سے ایک بڑی مچھلی نکالی . لیکن منصور کو زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اکیلی آئی تھی. اس نے اپنی آواز میں امرت گھولتے اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــ لکھی، کس ارادے سے چلی؟ اس سمے تنہائی کا سر پوشیدہ نہ رہا. لکھی کی چنچل نگاہیں جیسے فخر کے ساتھ جھک گئی. اس نے کہا ــ حضور ایک درخواست ہے ، ایک غریب کی درخواست .

منصور اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کہا ــ بولو .

لکھی نے چاروں طرف دیکھا. پھر اپنے لذ بذب پر قابو پاتے ہوئے منہ پر مصنوعی ہنسی لانے میں کامیاب ہوگئی . اب اس نے کہا ــ الشا کی سوکھی ہوئی ندی میں حضور اس سال آپ نے جوار کا پانی دیکھا ہے؟ دریا اور خشکی سب یک رنگ ہوگئی ہے . اب خشکی سے پانی اتر رہا ہے . ندی کے دہانے پر اگر ایک بند باندھا جاسکے تو بے شمار مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہیں اور ہم غریبوں کا بھی بھلا ہوسکتا ہے. حضور کا بھی کوئی نقصان نہ ہوتا . بلکہ کافی نفع رہتا .

جواب کی امید میں لکھی نے سر اٹھا کر منصور کو دیکھا . اس کی نگاہوں پر نظر ڈال کے منصور کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے ابر آلود آسمان کی طرف کچھ دیر تک اس طرح دیکھا گویا وہ کسی شدید الجھن کو سلجھا رہا ہے . پھر داڑھی کھجانے لگا . اب اس نے پوچھا ــ تم لوگ تو ہر سال ہی مچھلی بیچنے آیا کرتے ہو . آخر اس سال اس سوکھی ندی کو گھیر کر مچھلی پکڑنے کا منصوبہ کیوں بنایا ہے ؟

ــ نفع اور لکھی (خوش نصیبی) تو حضور ایک ہی چیز ہے نا . یہ کہہ کے اپنی ظرافت پر لکھی خود ہی ہنسنے لگی .

منصور نے اپنے انگ انگ کی ہر ہر رگ میں اس ہنسی کی بازگشت محسوس کی. وہ بے چین ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگا. پھر یک بیک لکھی کے سامنے کھڑے ہوکر کہا ــ لکھی ! میں اس خشک ندی کا تم لوگوں سے بندوبست کرنا چاہتا ہوں . یہ بھی محض تمہاری خاطر ہے. اس ندی سے ملحق یہاں کے کاشتکاروں کی زمینیں ہیں . اس سال پانی جس طرح بڑھا ہے اس سے خطرہ ہے کہ بھادوں کی فصل بالکل ہی نہیں ہوپائے گی اس پر سے بندھ باندھ کے اگر پانی روک دیا جائے تو ان کے کھیتوں کا پانی نکل نہ سکے گا اور ان کی فصلیں تباہ ہوجائیں گی . یہ سب نقصان اور بربادی دیکھ سن کر . . . .

لکھی نے اسے باتیں ختم نہ کرنے دیا اور بول پڑی ــ حضور! جوگول نے بھی یہ بات کہی تھی. اس نے کہا ہے کہ بندھ زیادہ دن رکھا نہ جائے گا اور حضور کے نقصان کو سلامی کے روپے سے پورا کردیا جائے گا .

منصور نے اس کے سارے جسم پر ایک تیز اور گہری نظر ڈالی. پھر گوشۂ لب پر ہنسی ظاہر کی . ان ہتھیاروں سے سج کر کہا ــ لکھی میں نفع نقصان نہیں سمجھتا . بس صرف تمہاری خاطر منظور ہے . سمجھی لکھی!

لکھی نے فوراً ہی جھک کر اس کے قدموں کو بوسا دیا اور سلام کرنے لگی. منصور اس سے گریز کا بہانا بنا کے جھک گیا اور اس کے ہاتھ گرم جوشی کے ساتھ پکڑ لئے . ٹھنڈا اور نرم ہاتھ . چنچل آنکھوں کی جوت سے ایک خاموش ستارہ شام کی کرن

جیسے ایک عیارانہ ہنسی کے ساتھ جھک گئی۔ اس نے ہاتھ چھڑا لئے، ٹوپا سر پر رکھا اور بجلی کی تیزی سے وہ کمرے سے نکل کر راستے پر ہو پڑی۔

بنگشی کے ساتھ جوگول کی علیک سلیک بہت دنوں سے تھی بنگشی بھی جوگول ہی کی ذات برادری کا ایک فرد تھا۔ مگر لکھی کی وجہ سے ان میں ان بن ہوگئی۔ بنگشی جوگول سے عمر میں بہت چھوٹا تھا اور وہ لکھی سے محبت کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ لکھی بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جوگول اسے جیت کے بیاہ لایا۔ برادری کے دباؤ اور مرفہ الحالی کے بل پر وہ لکھی کا پتی بن گیا۔ لکھی کی بے پرواہی سے بنگشی بے حد دل گرفتہ ہوگیا اور اسے اس بنا پر جوگول کے ساتھ شدید عداوت ہوگئی۔

الشا ندی کے کنارے بندھی ہوئی لمبی لمبی کشتیوں پر بے بوج قوم کے لوگ اڈا جمائے ہوئے ہیں۔ اس کے سامنے کھلے میدان میں گانے بجانے کی ایک محفل جمی۔ رات جتنی بھیگتی جارہی ہے اسی قدر گانے والوں اور گانے والیوں کے گلے کی آواز تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ کانسے کا برتن جو جھانجھ کی صورت میں بجایا جاتا ہے اس کی آواز مدھم ہوتی جارہی ہے۔ گانے کی تال پر جو لوگ ہلا کرکے ناچ رہے ہیں ان کے پیروں میں لغزش ہونے کی وجہ سے بے سراپن پیدا ہو رہا ہے۔ مگر سب بے تال و بے سر نہیں ہورہے ہیں جوانی میں جوگول رنڈی اور شراب نوشی کی کثرت کے لئے بدنام تھا۔ اس کی یہ شہرت اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نشے کے زور میں ڈھول پر سر اور تال سے بے نیاز ہو کر وہ ہاتھ چلائے جارہا ہے اور اب اس کا گلا بھی رندھتا جارہا ہے۔

او رسیلی جوبن والی کیسے تجھ کو بھولوں رے
تیرے پیچھے ہار کے سب کچھ اب کیا منھ کو کھولوں رے

بنگشی بھی کھڑا گانا سن رہا تھا ـــ اور سیلی جوبن والی ... دو ایک آدمیوں نے ذرا بد مذا ہو کر کہا بھی ـــ بنگشی ڈھول تھامو نا ۔ اس مدھوش کے ہاتھوں سارا گانا کر کرا ہوکر رہ گیا ہے ۔ بنگشی نے اب تک اس پر عمل نہیں کیا تھا مگر لکھی پر یکا یک اس کی نظر پڑگئی اور ایک ہی جست میں اس نے جوگول کے ہاتھ سے ڈھول چھین لیا ۔ نشے کا زور گھٹتے ہی جوگول نے آنکھیں ملیں اور بنگشی کی طرف دیکھا ۔ معاملے کو سمجھ کر اس نے اپنی پوری طاقت سے للکارا ـــ بنگشی ڈھول چھوڑ دے ۔

بنگشی نے ڈھول پر ہاتھ چلاتے چلاتے کہا ـــ جوگول بدمستی کی باتیں نہ کرو ۔ جاؤ، اس کے بعد محفل خوب جمی ۔

رس بھرے گانوں سے فضا ناچنے لگی ۔ جوگول کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہوگیا ۔ اپنے لمبے جسم کے ساتھ بجلی کی تیزی اور رعد کی کڑک کے ساتھ وہ بنگشی پر ٹوٹ پڑا ۔ اس نے بنگشی کو گردن سے گھسیٹ کر اس کے چہرے پر ایک بھر پور تمانچہ رسید کیا ۔ کچھ دیر کے لئے تو بنگشی کی نگاہوں میں دنیا تاریک دکھائی دی ۔ پھر اس نے آنکھیں ملیں اور ڈھول، جوگول، گانے والے اور سننے والے سب کو پیچھے چھوڑ کر آہستہ آہستہ مجمع سے کھسک گیا ۔ سب اس کے اس بزدلانہ فرار پر ہنسنے لگے ۔ ان ہنسنے والوں میں سب سے پرزور آواز لکھی کی تھی ۔

دوسرے دن بندھ باندھنے کا مقررہ دن تھا ۔ بنگشی اپنی کشتی چھوڑ کر سونا کاندی چلا گیا ۔ رمضان علی بڑا خوشحال

اور با اثر کسان تھا۔ بنگشی اس کی بھیٹک میں آبیٹھا ۔ شب بیداری کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ دل کے حریفانہ اور حاسدانہ جذبات باتوں کے اندر سے پھوٹے پڑ رہے تھے۔ حتی الامکان حالت معتاد پر آکر اس نے باتیں کرنے کی کوشش کیں ــ میں ادھر ہی آیا تھا ۔ سوچا کہ چلم کے دوکش لگاتا جاؤں ۔ سکندر میاں کہاں ہیں؟

سکندر رمضان علی کا بڑا بیٹا ہے۔ مچھلی کے کار و بار کی وجہ سے سکندر کے ساتھ بنگشی کا پرانا سلام کلام ہے ۔ رمضان علی نے کہا کہ سکندر کہیں باہر گیا ہے ۔ اس کے بعد وہ حقہ لانے اندر چلے گئے ۔

حقہ پیتے پیتے بنگشی نے آہستہ آہستہ باندھ باندھنے کا قصہ چھیڑا ۔ یہ سنتے ہی رمضان علی چیخ پڑا ــ خدا کی مار ! اب تدبیر ؟ تدبیر کیا ہے۔ ندی سے ملحق ہی رمضان علی کی زمین ہے اور اس کی سارے سال کی روزی کا اسی پر انحصار ہے ۔ ندی پر باندھ باندھنے سے بارش کا پانی تیزی سے اتر نہ سکے گا ۔ ہاں مچھلیاں ضرور پکڑی جاسکیں گی ۔ یہ سچ ہے کہ الشا ندی کے آس پاس کی ساری زمین زیرآب رہنے کی وجہ سے ساری فصل برباد ہو جائے گی۔ جو بندوبست بھی کرنا ہے ابھی کرنا چاہئے۔ سکندر گھر پر تھا نہیں اور دوسرے کا شتکار بھی اپنے دن کے کاموں کے لئے گھر سے باہر نکل گئے تھے ۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو رمضان علی نے بنگشی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا ۔ بنگشی نے ہنس کر کہا ــ آپ فکر نہ کیجئے ۔ سکندر میاں کو آتے ہی بھیجدیجئے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔

بنگشی کے دل کا جوش کسی قدر ٹھنڈا پڑا ۔ آس خشک ندی

کے باندھ سے اگر مچھلی کے ٹھیکے میں وہ شریک ہوتا تو اچھا نفع کما لیتا۔ مگر روپیہ کی لالچ میں بنگشی بلی بننا تو گوارا نہ کرسکتا تھا۔ اگر یہی بات ہوتی تو بے برج قوم کی لڑکیاں تک کیوں تیز تیز چھریاں اپنی کمروں پر باندھے پھرتیں؟

پورب کا سورج جب پچھم کے کناروں سے ہم آغوش ہونے لگا تو سکندر گھر لوٹا۔ باپ کے منھ سے خبر سنتے ہی وہ ندی کی طرف دوڑا۔ یونہی تو زمین پر کافی پانی جما ہوا ہے۔ اس کی بیوی سکینہ نے روکنا چاہا ۔کھانا کھا کے جاؤ۔ اس نے ہاتھ پکڑ کے بھی اس کو جانے سے باز رکھنا چاہا مگر وہ جست کر کے راستے پر جا چکا تھا۔

باندھ باندھنے کا اس روز کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ قریب ہی ایک ٹیلے سے جورگول اور لکھی سب دیکھ رہے تھے۔ باندھ کے اونچے سرے کے اوپر سے بھی پانی بڑی تیزی سے بہتا جا رہا تھا۔ الشا کی بڑی سمندری موجیں جا کر حد نظر تک پھیلی ہوتی تھیں۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے رنگین ہو کر اڑ رہے تھے۔ برسات کی سیاہ بدلی اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ لکھی یہ سب دیکھ رہی تھی اور جورگول باندھ پر نظریں جمائے تھا۔

سکندر ان دونوں کو دیکھ کے اک ذرا ٹھیر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سنجیدہ آواز سے کہا ۔ تم لوگوں نے کس کے حکم سے باندھ باندھا ہے؟ جورگول نے منھ پھیر کر دیکھا۔ سکندر کی غصہ بھری آواز سن کر اس کی آنکھ ناک اور زیادہ درشت ہو گئی۔ اس نے کرخت لہجے میں اور اپنی تضحیک آمیز گفتگو کا انداز نہ بدلتے ہوئے کہا ۔ جسے حکم دینے کا اختیار ہے اس کے حکم سے۔

لکھی نے آسے روک دیا. پھر آس نے اپنی چنچل نگاھوں کو سکندر کی آنکھوں پر گڑا کے معشوقانہ انداز سے ھنسی . بالکل آسی طرح جیسے وہ منصور کے سامنے ھنسی تھی . پھر آس نے کہا ــ کیا یہاں آپ کی زمین ھے؟ آپ نے اب کی بار پانی دیکھا؟ اگر باندھ نہ بھی باندھا جائے تو دس پندرہ دن تک پانی اترنے والا نہیں ھے . اس لئے باندھ باندھ کر اگر ھم غریب ماھی گیر چار پیسہ کمالیں تو آپ کا کیا نقصان ھے؟ جلدھی یہ باندھ توڑ دیا جائے گا.

سکندر کے منھ اور آنکھ سے کوئی خاص بات معلوم نہ ھوئی آس نے کہا ــ ایسا نہیں ھوتا . باندھ کے بیچ بیچ سے پانی بہت آھستہ آھستہ باھر ھوگا اور اتنے دنوں میں ھماری فصلیں بالکل ھی سڑ جائیں گی .

جوگول ایکا ایکی چیخ پڑا ــ کیوں نہیں ھوگا؟ یہ دریا تمھارا بھی نہیں اور ھمارا بھی نہیں جس کا ھے اس نے اجازت دی ھے تو آپ کیوں آنکھیں لال پیلی کر رھے ھیں ؟

جوگول کا مزاج یونہی کڑوا کسیلا ھے. پھر گذشتہ رات ھی سے وہ چڑچڑا بنا ھوا ھے . لکھی نے آسے روکنا چاھا تو الٹی دھمکی سنی. سکندر بھی ساتھ ھی ساتھ گرج اٹھا ــ ھم ضرور روکیں گے یہ ندی منصور میاں کی ھے مگر زمینیں ھماری ھیں . ھم اپنا دھان برباد ھونے نہ دیں گے .

یہ کہہ کے وہ تیزی کے ساتھ باندھ کے لئے لگے ھوئے بانسوں کی طرف لپکا. جوگول نے بڑے تلخ لہجے میں کہا ــ مالک کے حکم کے بغیر جو باندھ کو ھاتھ لگائے گا آس کی جان نہ بچے گی .

سکندر اس وقت غصے سے کانپ رھا ھے . آس کی باتوں سے اور تیز ھو کر اس نے ایک بانس اکھاڑ پھینکا . جوگول حیران

اور غصبناک ہو گیا ۔ بنگشی کو دیکھ دیکھ کر وہ اپنے مضبوط جسم کے بارے میں پرغرور حد تک خود فریبی میں مبتلا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سکندر آسے خاطر میں نہ لایا تو تیز تیز قدم بڑھا کر وہ ایک غضبناک چیخ کے ساتھ سامنے آیا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سکندر ہوشیار ہو چکا تھا۔ جوگول کو آتا دیکھ کر بس وہ اک ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے پینترا بدل کر ایک ایسی زوردار ضرب لگائی کہ جوگول زمین پر آرہا۔ دوبارہ اٹھنے کی جب اس نے کوشش کی تو سکندر نے اسے رگید مارا ۔ دونوں ہی مست ہاتھی کی طرح بھڑ گئے اور لڑتے رہے ۔ لکھی نے یہ نہ نہیں سوچا تھا کہ یہاں تک نوبت آجائے گی ۔ جب اس نے جوگول کو مار کھاتے دیکھا تو اس نے سکندر کے پھینکے ہوئے بانس کو اٹھا لیا اور اندازہ ٹھیک کر کے پورے زور کے ساتھ اس کے سر پر ایک ضرب لگائی ۔ سکندر نے ایک چیخ ماری اور وہ بیہوش ہو گیا ۔

زمین سے اٹھ کر دھول جھاڑتے جھاڑتے جوگول نے بڑی بے دلی کے لہجے میں کہا ــ جائے سالا مرے ۔

یک بیک وہ خاموش ہو کر کچھ دیر تک لکھی کو دیکھتا رہا اور پھر کہا ــ لکھی ، یہ اچھا نہیں ہوا ۔

لکھی اس وقت سکندر کے پھٹے ہوئے سر سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ فوارے کی طرح خون جاری ہے۔ خون بند کرنے کے لئے اس نے کپڑے کی ایک گدی تر کر کے رکھی ۔ اس نے جوگول کی بات سن کر کہا ۔ ابھی باتیں بند کرو۔ پھر سنوں گی۔ چلو اسے کسی طرح اٹھا کر لے چلیں ورنہ کوئی دیکھ لے گا تو مشکل ہوگی ۔

کشتی میں آ کے جوگول نے پھر کہا ــ لکھی، یہ کام ٹھیک نہیں ہوا ۔ ہم تو بس باندھ باندھنے کا حکم لائے تھے۔ اسے منصور

میاں کی بات بتا دینا تھا ۔ پھر وہاں جاکے یہ جو چاہتا کرتا ۔ اب اس کا پھٹا ہوا سر دیکھ کے گاؤں کے سب لوگ دوڑتے چلے آئیں گے۔ ہم ہیں ہی کتنے ؟ اب کوئی تدبیر نہیں ۔

لکھی نے ہنستے ہوئے کہا ــ تم ادھر دیکھو۔ تمہیں اس کی فکر کرنی نہیں پڑے گی ۔ تم جاؤ میں اسے سنبھال لوں گی ۔

ہوش آنے پر سکندر نے جس عورت کو دیکھا اس کا چہرہ بڑا غمگین تھا ۔ سکندر بھی دل شکستہ ہو گیا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر لکھی کے چہرے پر ہنسی رقص کرنے لگی ۔ پھر اس نے آنکھ ، ہونٹ ، ناک اور چہرے پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرا ۔ سکندر اس ادا پر ازخود رفتہ ہو گیا ۔ اس کے لمس نے دل میں ایک ہلچل پیدا کردی ۔

پھر یکایک اسے اپنی سکینہ یاد آئی ۔ اسے کھانا کھلانے کے لئے سکینہ نے کتنی غمناک التجائیں کی تھیں۔ اس نے اپنی باہیں پھیلا کر راستہ تک روکا تھا۔ اس یاد نے سکندر کے دل کو لکھی کی جانب میلان سے باز رکھا ۔ وہ کچھ دیر تک تیز تیز نگاہوں سے لکھی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ اسے حیران چھوڑ کر تیزی کے ساتھ کشتی سے اتر کر راستے پر ہولیا۔ سرکا درد بھی اسے روک نہ سکا۔

بنگشی نے جو چاہا تھا وہی ہوا ۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ایک بار جاکے سکندر کو لکھی کی آغوش میں بیہوش پڑا ہوا دیکھا تھا ۔ اسے دیکھ کر وہ ہنسا بھی تھا ۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی کوشش بے کار نہیں گئی ۔ اب سونا کاندی کے باشندے ضرور غضبناک ہوں گے ۔ سکندر کو مارنے کا انتقام باندھ کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے ہوئے بنگشی جو گول جیسے کانٹے کو بھی اپنی راہ سے ہٹانے گا ۔ کوئی اس پر شک نہ

کر سکے گا ۔ لوگ سمجھیں گے کہ گاؤں والوں کے ساتھ لڑائی میں وہ مارا گیا ہے ۔ پھر لکھی کو اپنا کے وہ کہیں اور جگہ چلاجائے گا۔ دور بہت دور ، سمندر کی لہروں میں نا معلوم جگہ لکھی خوش ہو یا ناخوش مگر وہ جوگول کو معاف نہ کرے گا۔ جوگول نے اسے زندگی میں بار بار شکست دی تھی اور آخری بار لکھی کو اپنا کے اس نے سب سے بڑا زخم پہنچایا تھا۔ جب زندگی کے خواب کا سارا مزا کرکرا ہوجائے تو انسان کس سہارے زندگی گذارے ۔

رات کی تاریکی جب زیادہ بڑھ چکی تو بنگشی تیار ہوکر نکل پڑا ۔ جوگول کشتی میں نہ تھا ۔ بنگشی یہ سمجھ کر آیا تھا کہ اس وقت جوگول موجود نہ ہوگا۔ لکھی نے پوچھا ۔کیا مطلب ہے ؟ بنگشی نے ایک پھونک مار کے چراغ گل کردیا اور کہا ۔ چپ رہ ، بہت چیخ پکار نہ کر ۔

دل ہی دل میں وہ منصوبہ ٹھیک کرنے لگا کہ اگر جوگول آجائے تو اس پر کس طرح حملہ کرے گا ۔ لکھی نے چیخنے کی کوشش کی مگر بنگشی نے زور سے اس کا منہ دبادیا۔ لکھی اندھیرے میں کمر کی چھری تلاش کرنے لگی لیکن بنگشی کے مضبوط ہاتھوں کی سخت گرفت نے اسے مجبور کر دیا اور وہ بے اختیار اس کے سینے سے جالگی ۔ پرانی رنجش اور ہوس ۔ بنگشی جوش میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے الشا کے سینے پر ایک طویل صدی گذر گئی ؛ باہر سے ایک ہلکی پکار سنی جانے لگی۔ بنگشی تڑپ کے اٹھا ۔ یقیناً جوگول واپس آگیا ہے ۔ سرگوشی کے طور پر اس نے دھمکاتے ہوئے لکھی سے کہا ۔ چپ چاپ رہ ، اگر تو چیخی تو سب سے پہلے تجھے ہی ختم کروں گا ۔

اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا وہ کشتی سے چھرا ہاتھ میں لئے باہر

نکلا ۔ اس نے سائے پر اطمینان سے نشانہ لگایا ۔ لکھی کی کشتی سے ملی ہوئی ایک اور چھوٹی ڈینگی کھڑی تھی ۔ آسی پر اکیلا وہ لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا ۔ ایک بھوکے بھیڑئے کی طرح بنگشی ٹوٹ پڑا ۔ ایک دلدوز چیخ ہوئی ۔ ابھی چیخ ختم نہ ہوئی تھی کہ جسم کو دریا برد کرنے کے لئے بنگشی نے آسے اوپر اٹھایا اور ساتھ ھی خود چیخ کر پیچھے ہٹ گیا ۔ لاش بے اختیار ندی میں جا گری ۔ یہ لاش جو گول کی نہ تھی منصور کی تھی ۔ بنگشی یہ سوچ بھی نہ سکا کہ وہ یہاں کس لئے آیا تھا ۔ آسے تو سوچنے کی مہلت بھی نہ مل سکی ۔ بے خیالی میں اس نے اس زور کا پیچھے سے دھکا کھایا کہ بے اختیار وہ دریا میں جا گرا ۔ یہ دھکا لکھی نے دیا تھا ۔ برسات کا اندھیرا آسمان، بس دو دھماکے ہوئے ۔ الھاہ الشا میں آج سمندری موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں ۔ بنگشی کو تلاش سے بھی تہ نہ مل سکی ۔ موجیں کھینچے لئے جارہی تھیں ۔ اس نے جان بچانے کے لئے دو بار پانی سے سر اوپر آٹھایا لیکن زمین کی ہوا جیسے آہستہ آہستہ بھاری ہوتی جارہی تھی ۔ اتنی دیر میں تو نہ جانے کتنی دور نکل گیا ۔ بڑی مشکل سے آخری بار آس نے سر نکالا ھی تھا کہ آسے دور بہت سے لوگوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں ۔ باندھ ٹوٹا جارہا تھا ۔ سونا کاندی کے لوگ چیخ رہے تھے ۔ بنگشی کانپ اٹھا ۔ اب باندھ ٹوٹ چکا تھا اور موجیں جیسے پہاڑی جھرنے کے ریلے کی طرح آرہی تھیں اور اسے بہائے لئے جا رہی تھیں ۔

دولت النسا خاتون

دولت النسا نے اپنے والد محمد یاسین صاحب کے مقام ملازمت بوگرا میں ۱۹۱۸ ولادت پائی . لور پرائمری امتحان پاس کرتے ھی ان کی شادی ھوگئی. لیکن حیرتناک امر یہ ھے کہ متاھل زندگی کے باوجود انھوں نے نوشت و خواند سے قطع تعلق نہیں کیا بلکہ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے باقاعدہ طور پر میٹرک، پھر آ ئی - اے - اور آخر میں بی - اے - کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی. یہ بات ان کی لیاقت وذھانت کے لئے کم قابل تعریف نہیں ھے . ان کے والد یاسین صاحب بھی ایک نامور ادیب تھے . اور ان کی یادگار بھی متعدد کتابیں ھیں باپ کی ادیبانہ مساعی نے بیٹی کو بھی متاثر کیا ھے . دولت النسا نے جس طرح متاھل زندگی میں امتحانات پاس کئے اسی طرح سیاسی اور قومی خدمات میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ھیں . ان کا مشہور ناول '' پونے پرش '' شائع کر کے انھوں نے ادیبوں سے نمایاں طور پر خراج تحسین حاصل کیا ھے .

کنگالن

کنگالن ہنس پڑتی ہے ـــ ہی ہی ہی ہی . . . . .

اس کے ہنسنے سے صرف آدمیوں کے دل میں دوڑنے والا خون ہی تھمتا نہیں معلوم ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے دل میں دوڑنے والا خون جمنے لگتا ہے . وہ ہنسی تاریکی میں کروٹیں لیتی ہوئی دور تر اندھیارے میں آہستہ آہستہ ڈوبی جاتی ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہنسی سیاہ ظلماتی چادروں میں اپنے نشانات چھوڑتی ہوئی اور سننے والوں کے دلوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے . جس سے بڑی دیرتک فضا کا ارتعاش بڑھ جاتا ہے اور تاریکی کی خوفناکی میں دفعتہً سخت اضافہ ہوجاتا ہے.

گاؤں کے نامی صراف ضمیرالدین کی نئی بیاهتا اور محبوب بیوی جوانی کی نشہ آور نیند میں غافل ہوکر سونے کے باوجود اس ہنسی سے جاگ پڑی ہے . اس نے خوف زدہ آواز میں کہا ـــ یہ کیسی آواز ؟

ـــ کچھ نہیں۔ ضمیرالدین نے طاقتور بازؤں سے بیوی کو اپنے سینے میں جذب کرتے ہوئے کہا . ” وہ کچھ نہیں ہے . وہ

ایک پگلی ہے ۔"

ــ پگلی ؟ شوہر کے مضبوط بازؤں اور چوڑے چکلے سینے میں گھس کر تقویت پاتی ہوئی بیوی نے یقین بھری آواز سے کہا ــ "باپ رے"! میرا دل چونک پڑا ۔ یہ کیسی خوفناک ہنسی سے ہنستی ہے ۔

ــ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ہنسی سن کے دل چونک ہی پڑتا ہے۔ اس کی ہنسی ایسی ہی ہے کہ جو لوگ بار بار سن چکے ہیں وہ بھی سننے سے ایکبار چونک ہی پڑتے ہیں ۔ یہ ہنسی جیسی خوفناک ہے ویسی ہی طنز آمیز ۔ جیسے کسی آسیب زدہ کی ہنسی ۔

مگر یہ بات بھی ٹھیک ہی ہے کہ دن کے وقت اس پگلی کو کبھی کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔ وہ گاؤں میں آتی بھی نہیں۔ گاؤں سے دور ایک بوڑھے برگد کے نیچے بیٹھی وہ اونگھتی رہا کرتی ہے۔ گھنٹوں بلکہ پہروں۔ پھر گھانس پھوس میں جیسے کچھ تلاش کرتی ہے ۔ نہ جانے کیا کھوجتی ہے اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کے اونگھنے لگتی ہے ۔

اسے کبھی کوئی کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھتا : وہ کیا کھاتی ہے اور کیا کھا پی کے جیتی ہے اسے کوئی نہیں جانتا ۔ بس. اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹھی یا تو اونگھ رہی ہے یا گھاس پھوس میں کچھ ڈھونڈھ رہی ہے۔ یہ بھی بس وہ لوگ ہی دیکھ پاتے ہیں جو اس گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے اس برگد کے قریب سے گذرتے ہیں ۔ اور کوئی کیوں دیکھنے جائے ۔

اسے بے دیکھے بھی سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ رات کو وہی پگلی ہنستی ہے وہ بھی بس اس رات جب وہ اس گاؤں میں سے گذرتی ہے ۔

* * * * *

دیکھنے سے پہچاننا بھی مشکل ہے ۔

ہاں گاؤں کے لوگ اسے پہچانتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ وہ نعیم الدین کی بیٹی شیریں ہے ۔

کتنے دنوں کی بات ہی ہے ۔

گاؤں میں سیلاب آیا ۔

بڑی گنگا کا باندھ ٹوٹ گیا ۔

سیلاب بھی کیسا سیلاب ! شیریں نے اپنی عمر کے سولہ برسوں میں ویسا سیلاب کبھی نہ دیکھا تھا۔ جدھر دیکھو بس پانی ہی پانی ۔ جیسے کسی نے بازی جیتنے کے لئے آسمان اور زمین کے بیچ میں بس چاند کے پتر بچھا دئے ہیں ۔

اس سیلاب کے توڑ میں گائے بیل بہہ گئے ۔ انہیں کے ساتھ بہت ساری چیزیں بہہ گئیں ۔ خالی دو ہاتھوں سے انسان اپنی جان اور ساری متاع حیات بچانے میں مشغول ہے لیکن نہ اسے اپنی کوشش کا پھل ملتا اور نہ مصیبت کی حد نظر آتی ۔

آخر ایک دن پانی گھٹنے لگا ۔ سیلاب کا پانی زور شور کے ساتھ اترنے لگا ۔ وہ جو کچھ بہا کر لے گیا تھا اس سے کہیں زیادہ چیزیں جاتے وقت چھوڑ گیا ۔ بیماری ، غم ، افلاس اور نہ جانے کیا کیا کچھ ۔ اس کے ساتھ دولت مند نفع اندوزوں کا لالچ اور حرص و آز ۔

غلاظت اور کیچڑ کا تاج پہن کر سیلاب زدہ کھیت دعوت غم دینے لگے ۔ کچھ دنوں کے بعد کیچڑ بھی سوکھ گیا اور زمین جا بجا سے پھٹ گئی اور کہیں کہیں سبزہ اگ آیا ۔ لیکن بھوکوں

کے پیٹ بھرنے کا سامان واپس نہ آیا ۔ اب لوگوں کے پاس کیا تھا بیماریوں کا سیلاب اور بھوک اور غم کا خزانہ ۔

شام ہوتے ہی گاؤں پر مرگھٹ جیسی خاموشی چھاجاتی ہے۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی ۔ کسی کے گھر سے اگر چراغ کی لو ایک جھلک دکھاتی بھی ہے تو فوراً بجھ جاتی ہے ۔ ایسے سمے تاریکی میں جس کی نظر بھی اس گاؤں پر پڑتی ہے اسے ایسا نظر آتا کہ جیسے یہ گاؤں بھوتوں کا مسکن ہے یا بنجر میدان ۔

اسی گاؤں کے ایک شکستہ گھر میں ایک باپ ہے اور ایک بیٹی ۔ یہ دو جانیں ۔ مگر یہ دو جانیں ہی جیسے دس جانوں کی طرح سخت جان ہے ۔

شیریں کے باپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا ۔ نہ زمین اور نہ بیل ۔ پھر دونوں کی روزی بھی آخر کس ذریعے سے فراہم کرے ۔ ہاں اس کے دو مضبوط اور جوان بیل ضرور تھے ۔ جسے خرید نے میں اسے اپنی آبائی زمین کا آخری قطعہ بھی بیچ دینا پڑا تھا ۔ سیلاب کے پانی نے ان دونوں کی جانیں ختم کردیں ۔ اب اس کے پاس کچھ نہ تھا ۔ باپ بیٹی اور خدا کی کشادہ زمین ۔

شیریں کا باپ سرسبز کھیتوں کی طرف مایوس نگاہوں اور غم زدہ دل کے ساتھ دیکھا ہی کرتا ۔ اب اس کے نصیب میں بس یہی ہے کہ جانوروں کی طرح اپنی اور شیریں کی بھوک اور بیماری مٹانے کے لئے تڑپتا رہے ۔ کئی دن ان کے بس شکرقند کھاکے گذرے ہیں ۔ اب کل سے پورا فاقہ شروع ہے ۔ آنتیں کاٹنے والا فاقہ ۔ سرسبزی چاہے جتنی بھی زرخیزی لائے شکر قند کھانے اور اسے بھی خریدنے کی تو طاقت چاہئے ۔ اب تو گاؤں کے سب لوگ ہی محض اسی پو گذارا کر رہے ہیں ۔

بوڑھے باپ کے سوکھے اور روز بروز لاغر ہونے والے چہرے کی طرف دیکھنے کی سکت بھی اب شیریں میں نہیں ہے۔ اس نے گھر کی آخری پونجی ایک کانسے کا گلاس لا کر باپ کے ہاتھوں میں دیا۔ یہ چھوٹا سا گلاس جسے بڑی مصیبتوں کے وقت بھی اس نے اپنے سے جدا نہ کیا تھا۔ یہ اس کے بچپن کی یادگار تھا۔ گھستے گھستے پتلا ہو چکا ہے۔ اتنے دنوں تک کسی قیمتی چیز کے عوض اسے دینے کے لئے شیریں راضی نہ ہوئی تھی۔ یہ اس کی ماں کا خریدا ہوا تھا۔ گھر کی پلی ہوئی مرغیاں بیچ کر اس نے اسے کیون پور کے میلے سے شیریں کے لئے خریدا تھا۔ آج ماں زندہ نہ تھی مگر اس کی یادگار اور اس کا بچا ہوا تحفہ تو موجود تھا۔ شیریں اسے اپنی جان کے ساتھ رکھتی تھی۔ اسی میں پانی یا دودھ پی پی کر وہ اتنی بڑی ہوئی تھی۔ سولہ برس کی۔

اس سے ماں زندہ تھی۔ شیریں کو اب بھی یاد ہے۔ ان کے ہاں دودھاری گائے تھی۔ جب معین الدین گائے کو دوہنے بیٹھتا تو پکارتا۔ بیٹی شیریں! دودھ نہیں پیو گی۔

شیریں وہی گلاس ہاتھ میں لئے دوڑی دوڑی آتی۔ تازہ، کچا، گرم گرم دودھ وہ غٹ غٹ پی جاتی۔ آسے اس گلاس کی اس وقت بھی ضرورت پڑتی جب وہ گڑیا کھیلنے بیٹھتی۔ اس سے شیریں کے کتنے ہی کام نکلتے۔ سن شعور سے پہلے آس نے آسی گلاس میں نہ جانے کتنی بار پانی پیا ہے، دودھ اور شربت پیا ہے۔ آج بھی شیریں اسی گلاس میں پانی پیتی ہے۔ وہ آسے ماں کی یادگار سمجھ کر اور زیادہ پاس رکھتی ہے۔

لیکن باپ کا منہ اب دیکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ آس نے چپ چاپ وہ گلاس باپ کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔

کے پیٹ بھرنے کا سامان واپس نہ آیا ۔ اب لوگوں کے پاس کیا تھا بیماریوں کا سیلاب اور بھوک اور غم کا خزانہ ۔

شام ہوتے ہی گاؤں پر مرگھٹ جیسی خاموشی چھاجاتی ہے۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی ۔ کسی کے گھر سے اگر چراغ کی لو ایک جھلک دکھاتی بھی ہے تو فوراً بجھ جاتی ہے ۔ ایسے سمے تاریکی میں جس کی نظر بھی اس گاؤں پر پڑتی ہے اسے ایسا نظر آتا کہ جیسے یہ گاؤں بھوتوں کا مسکن ہے یا بنجر میدان ۔

اسی گاؤں کے ایک شکستہ گھر میں ایک باپ ہے اور ایک بیٹی ۔ یہ دو جانیں ۔ مگر یہ دو جانیں ہی جیسے دس جانوں کی طرح سخت جان ہے ۔

شیریں کے باپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا ۔ نہ زمین اور نہ بیل ۔ پھر دونوں کی روزی بھی آخر کس ذریعے سے فراہم کرے ۔ ہاں اس کے دو مضبوط اور جوان بیل ضرور تھے ۔ جسے خرید نے میں اسے اپنی آبائی زمین کا آخری قطعہ بھی بیچ دینا پڑا تھا ۔ سیلاب کے پانی نے ان دونوں کی جانیں ختم کردیں ۔ اب اس کے پاس کچھ نہ تھا ۔ باپ بیٹی اور خدا کی کشادہ زمین ۔

شیریں کا باپ سر سبز کھیتوں کی طرف مایوس نگاہوں اور غم زدہ دل کے ساتھ دیکھا ہی کرتا ۔ اب اس کے نصیب میں بس یہی ہے کہ جانوروں کی طرح اپنی اور شیریں کی بھوک اور بیماری مٹانے کے لئے تڑپتا رہے ۔ کئی دن ان کے بس شکرقند کھانے گذرے ہیں ۔ اب کل سے پورا فاقہ شروع ہے ۔ آنتیں کاٹنے والا فاقہ ۔ سرسبزی چاہے جتنی بھی زرخیزی لائے شکر قند کھانے اور اسے بھی خریدنے کی تو طاقت چاہئے ۔ اب تو گاؤں کے سب لوگ ہی محض اسی پو گذارا کر رہے ہیں ۔

بوڑھے باپ کے سوکھے اور روز بروز لاغر ہونے والے چہرے کی طرف دیکھنے کی سکت بھی اب شیریں میں نہیں ہے۔ اس نے گھر کی آخری پونجی ایک کانسے کا گلاس لا کر باپ کے ہاتھوں میں دیا۔ یہ چھوٹا سا گلاس جسے بڑی مصیبتوں کے وقت بھی اس نے اپنے سے جدا نہ کیا تھا۔ یہ اس کے بچپن کی یادگار تھا۔ گھستے گھستے پتلا ہو چکا ہے۔ اتنے دنوں تک کسی قیمتی چیز کے عوض اسے دینے کے لئے شیریں راضی نہ ہوئی تھی۔ یہ اس کی ماں کا خریدا ہوا تھا۔ گھر کی پلی ہوئی مرغیاں بیچ کر اس نے اسے کیون پور کے میلے سے شیریں کے لئے خریدا تھا۔ آج ماں زندہ نہ تھی مگر اس کی یادگار اور اس کا بچا ہوا تحفہ تو موجود تھا۔ شیریں اسے اپنی جان کے ساتھ رکھتی تھی۔ اسی میں پانی یا دودھ پی پی کر وہ اتنی بڑی ہوئی تھی۔ سولہ برس کی۔

اس سے ماں زندہ تھی۔ شیریں کو اب بھی یاد ہے۔ ان کے ہاں دودھاری گائے تھی۔ جب معین الدین گائے کو دوہنے بیٹھتا تو پکارتا۔ بیٹی شیریں! دودھ نہیں پیو گی۔

شیریں وہی گلاس ہاتھ میں لئے دوڑی دوڑی آتی۔ تازہ، کچا، گرم گرم دودھ وہ غٹ غٹ پی جاتی۔ آسے اس گلاس کی اس وقت بھی ضرورت پڑتی جب وہ گڑ یا کھیلنے بیٹھتی۔ اس سے شیریں کے کتنے ہی کام نکلتے۔ سن شعور سے پہلے آس نے آسی گلاس میں نہ جانے کتنی بار پانی پیا ہے، دودھ اور شربت پیا ہے۔ آج بھی شیریں اسی گلاس میں پانی پیتی ہے۔ وہ آسے ماں کی یادگار سمجھ کر اور زیادہ پاس رکھتی ہے۔

لیکن باپ کا منہ اب دیکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ آس نے چپ چاپ وہ گلاس باپ کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔

نعیم الدین کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا. تاہم وہ گلاس واپس بھی نہ کر سکا وہ کچھ دیر تک کھڑا آس گلاس کو دیکھتا رہا اور پھر مستفسرانہ بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا. شاید وہ یہ سوچ رہا تھا ــ اور پھر اس کے بعد ؟

وہ بعد کی بات باپ کی طرح بھی نہ سمجھ سکی . اسے بس حال یاد ہے . مستقبل کو کون جانے ؟

باپ کو رخصت کرنے کے بعد شیریں دیوار کے ستون سے لگی کچھ دیر تک کھڑی رہی . پھر آہستہ آہستہ باورچی خانے میں گھس گئی. چولھے میں کئی دن سے آگ نہیں جلی تھی. اس لئے آس میں نونا مٹی لگ گئی تھی .آس نے چولھے کو لیپ کر بھات پکانے کی ہانڈی کو پھر سے دھویا. کچھ کھر پات جمع کر کے وہ اٹھی اور باہری دروازے کی کنڈی لگانے گئی .

مگر منھ پھیرتے ہی وہ اس طرح چونک پڑی جیسے کوئی بھوت دیکھ کر چونک پڑتا ہے . باپ خالی ہاتھ واپس آیا ہے .

ــ بازار میں چاول نہیں ہے . تھوڑا بہت جو آیا بھی تھا گراں قیمت پر فوراً بک گیا .

گاؤں میں دام دے کر چاول خریدنے ہی کی سکت بھلا کتنے لوگوں میں تھی . جو لوگ بچ گئے تھے گھر گھر کی خاک چھانتے رہے . اور اب بھگت رہے ہیں . درختوں کی جڑیں ، پتے ، چھالیں تک کھا ڈالیں . اب بیماری ہے اور موت . پھر بھی بازار میں چاول کا قحط ہے . کیسی عجیب بات !

شیریں کا باپ لوگوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھ اور سن آیا ہے کہ گاؤں کے نامی صراف ضمیرالدین کے خفیہ گودام میں چاول کا کافی ذخیرہ موجود ہے مگر پیسہ دے کے بھی سب کو چاول

دستیاب نہیں ہوتا۔ شیریں کے باپ جیسے بدحالوں کے لئے تو چاول واقعی نایاب ہی تھا۔ جیسے سانپ کے پاؤں یا گوار کے پھول۔ جن کے پاس زمینیں تھیں یا انہیں چاول میسر تھا یا جن کے پاس کوئی اور دھن تھا وہ پا سکتے تھے۔

مگر بیچارے شیریں کے باپ کے پاس کس چیز کا زور تھا؟

یہ سمجھنا ہر ایک کے لئے آسان تھا کہ یہ سب چالیں محض اس لئے تھیں کہ سستے داموں غریب کسانوں کی زمینوں کو ہتھیا لیا جائے۔ چاول چاہو تو زمین دو۔ ضمیرالدین نے علانیہ کہا۔ کسان اسی وقت ٹھیک رہتے ہیں جب وہ فاقہ مست ہوں۔ جب ان کا پیٹ بھرتا ہے تو سر پر خون سوار ہوجاتا ہے۔

شیریں کے منہ سے باتیں بھی نہ نکل سکتی تھیں۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتی آئی تھی کہ پیسہ حاصل کرنا ہی مشکل کام ہے مگر آج اسے معلوم ہوا کہ چاول حاصل کرنا بھی اس سے کم دشوار کام نہیں ہے۔

وہ صحن میں بیٹھی اپنے کمزور اور بھوکے باپ کی حالت دیکھتی رہی۔ آج کتنے دنوں سے وہ تقریباً بھوکے ہی دن گذار رہے ہیں۔ انہوں نے پیٹ میں جو کچھ بھرا بھی اسے غذا نہیں کہا جاسکتا۔ شیریں کا باپ جگہ سے اٹھتا بھی تو کانپ کے بیٹھ جاتا۔ شیریں نے سوچا تھا کہ آج دو مٹھی بھات پکا کے باپ کا پیٹ بھر سکے گی اور خود بھی دو چار لقمے نگل سکے گی۔ چولھے پر بھات کی سوندھی سوندھی خوشبو تک اس نے محسوس کی تھی۔

شیریں نے باورچی خانہ کے بند بیڑوں کی طرف ایک نظر دیکھا، پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کے باپ کے پاس آ کھڑی ہوئی مگر بھوک، پیاس اور مایوسی نے اس کی زبان پکڑلی۔ کہے بھی

تو کیا کہے۔

یہ تو جنم بھر کے دکھی تھے۔ دکھ اور مصیبت سے ان کی کوئی نئی مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ بلکہ اب تک تو شیریں خود کو بہت سکھی سمجھتی آئی تھی۔ مگر اب تو ناقابل برداشت دکھ اور ناقابل بیان صدمہ سامنے تھا۔ کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں۔ آس کی اپنی کوشش بھی تو بے سود ہی تھی۔ نہ جانے وہ کس غیبی بے درد ہاتھ کے مارے تھے۔ سب کا تو ایک ہی حال تھا۔ جس کے پاس پیسہ بھی تھا آس کو بھی چاول میسر نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء کے قحط میں بھی تو یہی حال ہوا تھا۔ اس وقت شیریں کی عمر سات سال کی تھی۔ آسے اب وہ دن اچھی طرح یاد بھی نہیں۔ مگر وہ لوگ اس دفعہ بچ تو گئے تھے مگر اب کی بار تو بچنے کی کوئی امید باقی ہی نہ تھی۔

صبح کے وقت شیریں کے باپ نے کہا ــ بیٹی، میرا گمچھا دے۔ ذرا نکلوں اور دیکھوں کہ صراف کا بیٹا خوشامد درآمد سے کچھ چاول دیتا ہے یا نہیں۔

کندھے پر گمچھا لئے بوڑھا کھانستے کھانستے لاٹھی کے سہارے چل پڑا۔

سن کر ضمیرالدین نے پیشانی پر پہلے بل ڈالا اور پھر عجیب انداز سے کہا ــ چاول؟ میرے پاس؟ پاگل ہوئے ہو؟ اگر میرے پاس چاول ہوتا تو گاؤں کے لوگ بے کھائے مرتے؟ بھات کیسا؟ نہ جانے کیا کچھ کھا پی کے تو میں دن کاٹ رہا ہوں۔

شیریں کے باپ میں اور کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی۔ کانپتے کانپتے، دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے اس نے گھر لوٹنے سے پہلے ایک بار پھر بڑی عاجزی سے کہا ــ تین دن سے وہ بھوکا ہے

صراف صاحب کے بیٹے رحم کرو!

شیریں کے باپ کی آواز اور کھڑے ہونے کے انداز کو دیکھ کر ضمیرالدین نے کہا ــ نعیم الدین کیا تمہارے پاس زمین زراعت کچھ بھی نہیں ہے؟

ــ ہاں بدنصیبی ہے۔ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے نعیم الدین نے کہا ــ صراف صاحب کے بیٹے، دو جوان بیل تھے جو اس سیلاب کے نذر ہو گئے۔ آج وہ جوڑی اگر ہوتی، تو مجھے کیا فکر ہوتی۔ آسے جیسے اپنے جڑواں بچوں کے مرنے کا غم ہوا اور وہ زار زار رونے لگا۔

ضمیرالدین نے بے نور آنکھوں سے چپ چاپ اس کی طرف دیکھا پھر ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھ کر اس نے آنکھیں نچاتے نچاتے کہا ــ ہاں نعیم الدین، یہی تو بات ہے۔ کہو میں کیا کہوں۔ تم تو اپنے گاؤں کے آدمی ہو۔ مجھے سن کے دکھ بھی ہوتا ہے۔ تین دن کا فاقہ ہائے ہائے۔ اچھا میرے اپنے کھانے میں سے آج تھوڑا چاول لیتے جاؤ۔ مگر شیخ صاحب، ڈیڑھ روپیہ سیر دام ہوگا۔

ــ ڈیڑھ روپیہ۔ کس برتے پر ہمت کروں۔ اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گا صراف صاحب کے بیٹے۔

ــ میں کیا کروں۔ اب نقصان کر کے تو دے نہ سکوں گا۔ بس جس بھاؤ میں نے خریدا ہے آسی حساب سے دے رہا ہوں۔

شیریں کے باپ نے کمر سے کھول کے ایک روپیہ اس کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا ــ صراف صاحب کے بیٹے، یہی میرا سب کچھ ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔

ــ بابا، آٹھ آنہ نقصان، یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

شیریں کے باپ کی آنکھوں سے سونے پھوٹ پڑے۔ پھر اس نے

کہا ــ صراف صاحب کے بیٹے ! تمھارے پاس بہت کچھ ہے ۔ تم آٹھ آنے میں نہ مر جاؤ گے ۔ مگر یہ بوڑھی ہڈی تو اب بےکھائے مر ہی جائے گی ۔ بیٹی بھی گھر میں مر رہی ہے ۔ صراف صاحب اک ذرا مہر بانی کرو ۔

بیٹی ! تمھاری بیٹی ؟ اوہ شیریں ، اب تو وہ خوب جوان ہو گئی ہے نا ؟ ایں ؟

شیریں کے باپ نے گرم آنکھوں سے ضمیرالدین کی طرف دیکھا ۔

ــاچھا جاؤ ، میں نے تمھارے لئے آٹھ آنہ چھوڑ دیا ۔ تم تو اپنے ہی گاؤں کے ہو تمھارا دکھ درد اگر میں نہ سمجھوں تو اور کون سمجھے گا ۔ نقصان ہوا ، ہو یہ نقصان میں پورا کر لوں گا دوسری طرح سے ۔ یہ کہہ کے ضمیرالدین دانت نکال کے کھلکھلا پڑا ۔

گمچھے میں چاول کی پوٹلی لئے نعیم الدین اٹھ کھڑا ہوا مگر جاتے جاتے اس نے گرم نگاہوں سے پھر ایکبار ضمیرالدین کی طرف دیکھا ۔

مگر آخر اس طرح کتنے دن چلتا ۔ کئی روز گذرے اور پھر آخر گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح شیریں کے باپ نے بھی دم توڑ دیا ۔

شیریں کو بھی مرنا ہی پڑتا مگر آسے ضمیرالدین نے بچایا ۔

آس سے ضمیرالدین نے کہا ۔ تجھے کیا فکر ؟ میرے رہتے گاؤں کی لڑکی بے کھائے مر جائے گی ؟ کہتی کیا ہے ؟

شیریں شکر گذاری کے لئے الفاظ نہ پاسکی ۔ بس صرف باپ کی نئی قبر کی طرف دیکھتی رہی ۔

گاؤں کے لوگوں نے کہا ــ برا کیا ہے ؟ صراف کے گھر

کتنی داسیوں اور باندیوں کا گذر ہوتا ہے ۔ وہاں محنت مزدوری کر کے دو مٹھی بھات کیا شیریں نہ پا سکے گی؟ پھر یہ کہ جوان جہان لڑکی ، تنہا اپنے گھر میں رہے بھی تو کیسے ؟

ضمیرالدین نے جن لوگوں کو یہ کام کرانے پر مامور کیا تھا ان کے ذریعہ آس نے شیریں کے اڑوس پڑوس کے لوگوں کو کم دام پر قرض چاول دے کے اپنا ہمنوا بنا لیا اور اپنی سخاوت کا ڈھنڈورا بھی پیٹا ۔

دوسرے دن وہی لوگ شیریں کو ضمیرالدین کے گھر پہنچا گئے ۔ یہاں شیریں کو پناہ ملی ۔

ان کے سکھائے ہوئے الفاظ میں شیریں نے اظہار شکر گذاری میں کہا ــ آپ کے گھر میں کتنی داسیاں اور باندیاں ہیں ــ میں بھی . . . .

ضمیرالدین نے ہنس کر بات کاٹی ! شیریں داسی باندی کیوں کہتی ہے ، تو تو میرے گھر کا چراغ بنے گی ۔

اور تین بیبیاں بھی گھر کو روشن کئے ہوئے ہیں ۔ پھر بھی سنا گیا کہ وہ شیریں سے شادی رچا کے واقعی آسے چراغ خانہ بنائیں گے ۔

دوسرے لوگ سن کر بولے ــ واقعی یہ آس کی قسمت ہے ۔ یوں بے کھائے مرتی ۔ اب تو وہ سب بیگمات کی ملکہ بنے ۔

مگر چند مہینے ہی گذرے تھے کہ یہ بھی سنا گیا کہ اس کی شادی ضمیرالدین سے نہیں ہوگی بلکہ ان کے ملازم خاص عین الدین سے ہوگی. ہاں ضمیرالدین کی بھی چوتھی شادی قریب ہی کے نامی باشندے نظام الدین زمیندار کی بیٹی سے طے پا گئی ۔

آہستہ آہستہ یہ بات شیریں کے کان تک بھی پہنچی :

پہلے پہل تو وہ چونک پڑی ۔ پھر جا کے ضمیرالدین کے پیروں پر پچھاڑ کھا کے گر پڑی ۔

ضمیرالدین نے اک ذرا پریشانی کا سا انداز بنا کے کہا ــ یہ کیا ؟ ، یہ کیا ؟ تمھیں کیا ہوا ؟ ایں ؟

ــ کیا آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے ؟

ــ تجھ سے شادی؟ ضمیرالدین کیا آسمان سے زمین پر آجائے گا۔ تجھ سے شادی؟ کہتی کیا ہے ؟ کیا میری کوئی بھی عزت نہیں رہ گئی ۔ بس ہر ایسی ویسی کو میں بیوی بنا لوں گا ؟

ــ تو آپ نے مجھے ہر طرح برباد کیوں کیا؟ کیوں کیا؟ اب وہ پاگلوں کی طرح یہی کہتی تھی اور اپنا سر ضمیرالدین کے قدموں پر پٹکتی تھی ۔

ضمیرالدین نے اپنا پیر ہٹاتے ہوئے اک ذرا نرمی سے کہا ــ میں نے تیری شادی عین الدین سے ٹھیک کر دی ہے ۔ اب کی جمعہ کو عقد کردوں گا ۔

عین الدین کے ساتھ ؟

شیریں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا ــ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں ۔ اس نے کہا ــ عین الدین سے ؟ چچی چچی ، آپ کیا کہتے ہیں ؟ میں تو سمجھ بھی نہیں سکتی ۔ خدا جانتا ہے اور آپ جانتے ہیں مگر آپ نے مجھے امید دلا رکھی تھی۔

ــ کیا کہا ؟

شیریں جیسے کچھ سن نہ سکی ۔ بالکل بے سہارے انسان کی طرح اس نے پھر ضمیرالدین کے پیر تھام لئے ۔ آپ اپنا وعدہ

پورا کیجئے . رحم کیجئے . میں ایک داسی باندی کی طرح گھر کے ایک کونے میں ــ

ــ کیا کہا ، حرامزادی ! جتنا بڑا منھ نہیں اتنی بڑی بات! ایں، بے کھائے مر رہی تھی. میں نے گھر میں جگہ دی ، کھانا دیا، کپڑے دئے اور اس کا یہ پھل ؟ بدذات کہیں کی . کتوں کی طرح سر پر چڑھی جارہی ہے . جانکل جا میرے گھر سے باہر ہو . اور پھر ساتھ ساتھ ایک لات .

شیریں لات کے زور سے صحن میں جا گری .

کنگالن زور زور سے قہقہے مار نے لگی ــ ہا ہا ہا . . . .